فکرِ نو

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

[illegible]

غالب نمبر

دلی کالج اردو میگزین

۱۹۶۹

فکرِ نو

غالب نمبر

ترتیب

سید حسن [رئیس تحریر]
گوہر سلطانہ [اڈیٹر]
تنویر احمد علوی [نگراں]
رقیہ ناز [معاون]

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

غالبؔ

باہتمام پروفیسر سید حسن پرنٹر پبلشر جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپا

ترتیب

[ایڈیٹوریل]

صریرِ خامہ

[ہوئی تاخیر......]

غالب کی صد سالہ برسی کے پیشِ نظر کچھ ساتھیوں کی خواہش اور بعض اساتذہ کی فرمائش پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سال کے لئے دہلی کالج اُردو میگزین کی اشاعت کو غالب سے متعلق مضامین کے واسطے مخصوص کر دیا جائے تو اس سلسلہ کی ضروری تیاری بالخصوص مضامین کی فراہمی کے لئے وقت بہت کم رہ گیا تھا —— باہر سے مضامین آنے کی توقع نہ ہونے کے برابر تھی اور کالج کے اپنے اساتذہ اور طلبا سے بھی وقت کی کمی کے باعث اچھی خاصی تعداد میں مضامین ملنے کا امکان نہ تھا۔ بہرحال امکان سے زیادہ امید کے سہارے پر اس کام کو شروع کیا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ اس میں ہمیں اپنی توقع سے کچھ زیادہ کامیابی ہوئی۔ اس کے لئے ہم ان تمام اساتذہ اور طلبا کے شکرگذار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر مقالات و مضامین ترتیب دیئے۔

اس ضمن میں مکرمی موسوی صاحب، مرزا محمود بیگ صاحب ڈاکٹر قمر رئیس صاحب، جاوید صاحب اور سید ضمیر حسن صاحب کے ہم بطورِ خاص ممنون ہیں کہ ان حضرات نے ہمیں اپنے گراں قدر مضامین اور نگارشات سے نوازا اور اس شمارہ کی تیاری کے سلسلہ میں ہمیں مناسب مشورں سے مرحمت فرمائے اپنے ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا خود اپنا شکریہ ادا کرنا ہے یہ ان کا اپنا میگزین ہے اور اس سے درحقیقت ان ہی کے علمی شوق و شغف اور ادبی کار و افکار کا اندازہ ہوتا ہے۔

حق ناشناسی ہوگی اگر ہم سب کی جانب سے رئیس تحریر جناب سید حسن صاحب کی کرم فرمائی اور اس شمارہ کی اشاعت کے لئے ہماری حوصلہ افزائی کا اعتراف نہ کیا جائے۔ انہیں کی بدولت ہماری بہت سی مشکلات دُور ہوئیں اور اس کے لئے وسائل کی فراہمی ممکن ہو سکی۔

غالب پر اب تک صدہا مضامین لکھے جا چکے ہیں، کتابوں کی ایک بڑی تعداد الگ ہے لیکن جیسا کہ اربابِ نظر سے پوشیدہ نہیں اس سلسلہ کے بیشتر مضامین مدلل تحسین کی حیثیت رکھتے ہیں یہ تحسینی انداز جہاں غالب کی تفہیم میں کچھ مدد دیتا ہے وہاں غالب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے مطالعہ میں چند در چند دشواریاں بھی پیدا کرتا ہے۔ جس سے کسی طرح صرفِ نظر مناسب نہیں، غالب پر تنقید کرنا تفاخرِ تعصب سے آزاد ہونا چاہیئے اسی کے ساتھ تکرارِ خیال سے بچنا بھی ضروری ہے کہی ہوئی بات کو لہجہ یا لفظ بدل بدل کر بار بار کہنا تحصیل حاصل ہے، اس سے غالب کو تو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا

ہاں اُردو زبان اور اس کے ادب کو یہ نقصان ضرور ہوتا
ہے کہ تاریخ و تنقید کے بہت سے گوشے اُردو میں یا
اُردو سے متعلق کام کرنے والوں کی توجہ سے محروم
رہ جاتے ہیں۔

غالب کی صد سالہ یادگار کے موقع پر اگر تمام پروگرام
خود غالب سے متعلق نہ ہوتے تو شاید اُردو زبان و ادب
کی اشاعت، ترویج تنقید اور تحقیق کے سلسلہ کا قابلِ
ذکر کام انجام پاجاتا اور اس کی وجہ سے غالب کی صد
سالہ برسی کی تاریخی اور ادبی اہمیت بھی بڑھ جاتی۔

آج بہت سی دولت، وقت اور محنت صرف
کرکے غالب پر فرضی ڈرامے، اوپیرا اور بیلے پیش کرکے
اُردو زبان اور اس کے ادب کو زندہ رکھنے کی کوشش
کسی تفریحی رسم کی بجا آوری سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی
غالب بھی اسی وقت تک غالب ہیں جب تک اس
مُلک میں اُردو زبان اور اس کا ادب زندہ ہے اور
یہ دونوں آج اپنی تاریخ کے جس نازک دور سے گذر
رہے ہیں اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

گفتنی نیست کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

زیرِ نظر شمارہ میں شامل کئے جانے والے مضامین
نقشہائے رنگ رنگ کی سی حیثیت رکھتے ہیں جس
کا اندازہ اُن کی "ترتیب" پر ایک نظر ڈالنے سے
بھی ہوسکتا ہے۔

ان میں بعض مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار
سے غالب کی سیرت و سوانح اور شعور و شعر کے ان
پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں جن پر بالعموم توجہ نہیں کی
جاتی ان پہلوؤں پر گفتگو غالب کی عظمت کے منافی
نہیں اس کا مقصد غالب پر آزادانہ تحقیق و تنقید کی
روایت کو نئی نسل کے سامنے رکھنا ہے، جسے تحسین و
نفرین کے دائروں سے الگ ہوکر غالب کی عظمت
کو پرکھنا چاہیئے۔

غالب کے حال و خیال میں ان کے اپنے انفرادی
شعور کا عکس بھی ملتا ہے اور اس تمدّنی روایت
کا پرتو بھی جو ان کے دور میں مغل تہذیب اور فارسی
شاعری کے وسیلہ سے اُردو زبان و ادب کے ضمیر و خمیر
میں داخل ہوگئی تھی غالب کے کردار و افکار کو اس
روایت سے کلیتاً الگ کرکے دیکھنا صحیح نہیں۔ اور
اکثر غلط اخذ نتائج کی طرف ذہن کی رہنمائی کرتا ہے۔

وفیات

گذرنے والے تعلیمی سال کے دوران پروفیسر
نجیب اشرف ندوی ڈائرکٹر اسلامک اُردو ریسرچ
انسٹیٹیوٹ بمبئی کے انتقال پُر ملال سے اُردو علم و ادب
کی دُنیا کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے موصوف
شبلی کے دبستانِ فکر کی نابغۂ شخصیتوں میں سے تھے،
نصف صدی تک مرحوم نے جس خلوص و خصوص کے
ساتھ تحقیق، تنقید اور تدریس کے ذریعہ اُردو زبان و
ادب کی گراں قدر خدمت انجام دی ہے اس
کی مثالیں ہمارے دور میں نایاب نہیں تو کمیاب
ضرور ہیں،

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ندوی صاحب کی وفات
حسرتِ آیات سے اُردو علم و ادب کی بالائی صفوں

کی رونق کم ہوگئی ہے۔

شیر خاں کی موت دہلی کالج اور اس کے وابستگان
کے لئے ایک سانحہ ہے وہ طلبا اور اساتذہ کے مابین یکساں
طور پر ہر دل عزیز تھے، کالج کے ایک دیرینہ مُلازم کی
حیثیت سے وہ اس ادارہ کی زندگی کا جیسے ایک جزو
بن گئے تھے، ان کی وفات نے کالج کو ایک وفادار ملازم
کی خدمت اور اس کے طلبا کو ایک پُرخلوص انسان کی
محبت سے محروم کر دیا ہے۔

اسی سال تعلیمی سال کے دوران عبدالمتین طالب علم بی اے
پاس تھرڈ ائیر اور شیلجا سا شنکر بی اے آنرس سال دوم نے حادثات کا شکار
ہو کر عالم نوجوانی میں وفات پائی۔ ان مرنے والوں کے خلوص اپنایت کی
یاد ان کے ساتھیوں اور استادوں کے دلوں میں تازہ ہے۔

رفتید ولے نہ از دل ما

غالب

مکرمی موسوی صاحب کا مکتوبِ گرامی

مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ دہلی کالج اُردو میگزین کے نئے شمارہ برائے ۶۹-۱۹۶۸ء کو غالب کی صدسالہ برسی کے پیش نظر غالب سے متعلق مضامین کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اور اس کی تمام ضروری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اس موقعہ پر کالج کی روایات اور مناسب حدود کا خیال رکھتے ہوئے کسی ایسے شمارہ کی اشاعت ضروری تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ قدیم دہلی کالج کی علمی تحریک اور غالب کے ذہن کی جدت پسندی میں گہرا تعلق ہے وہ دہلی کالج سے براہ راست وابستہ نہیں ہوتے یہ ایک اتفاقی امر تھا۔ لیکن یہ بھی ہماری ادبی اور تہذیبی تاریخ کے عجیب اتفاقات میں سے ہے کہ غالب کے انفرادی شعور میں جس جدید ذہن کا طلوع ہوتا ہے اس کو اجتماعی شعور بنا دینے کی عہد آفریں کوشش دہلی کالج کی جانب سے عمل میں آئی ہے۔

وہی اک بات یاں موج نفس واں نکہت گل ہے

غالب کی وفات کو پورے سو سال گذر چکے ہیں اور آج جبکہ ہم ان کی صدسالہ یادگار منا رہے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غالب آج کے ادیب اور شاعر ہیں اور آج بھی ہم میں موجود ہیں۔ ان کی وفات سے اب تک زمانے نے کتنے ہی رنگ بدلے کتنے ہی دور آئے اور ہر دور نے اپنے ادیب اور شاعر پیدا کئے یہاں تک کہ جدید شاعری اپنی نئی علامتوں کے ساتھ وجود میں آ گئی اس سلسلہ میں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ غالب کے شعور نے ہر دور میں ہماری ذہنی اور ادبی تحریکات کا ساتھ دیا ہے، حالی سے اقبال اور اقبال سے فیض و فراق تک ہمارا کون سا قابل ذکر شاعر ایسا ہے غالب نے جس کو متاثر نہیں کیا۔

بقول حالی غالب کے عہد میں دہلی میں ایسے اصحاب علم اور ارباب فن کا اجتماع ہو گیا تھا جن کے جلسوں کو دیکھ کر اکبری اور شاہجہانی کی یاد آتی تھی۔ غالب کے یہاں دلی کے اس عہد کی فکری بالیدگی علمی ذوق اور ادبی شعور کے ساتھ اس کے رُوحانی کرب اور ذہنی کشمکش کی بھی پرچھائیاں ملتی ہیں جس سے آنے والے عہد کی نشان دہی ہوتی ہے جو عہد گذر رہا ہے وہ اسکا واضح شعور رکھتے ہیں اسی کے ساتھ وہ آنے والے زمانہ کے تقاضوں سے بھی واقف ہیں۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

غالب کے بعد ان کی شاعری اور شخصیت پر بہت کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ذہن اور زندگی کے بارہ میں مزید کچھ کہنا اور کچھ سوچنا

باقی ہے ؎

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

ایک بلند پایہ ادیب اور فن کار کی طرح ان کی شاعری معلوم کو محسوس میں بدل دیتی ہے ان کے یہاں حیات و کائنات اور حقیقت و مجاز کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے۔

وہ زندگی کی ثنویت کے قایل نہیں معلوم ہوتے ان کا ذہن روح کو مادہ سے الگ کر کے دیکھنا نہیں چاہتا ان کے یہاں روح مادہ دونوں ایک ہی چیز نظر آتے ہیں ؎

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اس پورے قطع کو پڑھ جائیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہنی سفر کی سمت کیا ہے۔

غالب نے صرف خواب ہی نہیں دیکھے حقیقت سے کبھی آنکھیں چار کی ہیں ان کے یہاں ذہن کی رسائیوں اور عمل کی نارسائیوں کا تذکرہ جا بہ جا ملتا ہے جو خود ان کا اور ان کے اپنے دور کا ایک المیہ ہے۔ انھوں نے زندگی کے خوب و زشت کی عکاسی کی ہے اور خوب کی ہے زندگی کو زندگی کی طرح دیکھنا ان کے شعور کا ایک بہت نمایاں پہلو ہے وہ زندگی کے لطف و لذت ہی سے آشنا نہیں اس کی تلخیوں اور الم انگیزیوں کے بھی خوگر ہیں اور رنج و الم کو زندگی کا جزو لازم سمجھتے ہیں ؎

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

• غالب عشق کی لذت سے خوب واقف ہیں ان کے نزدیک عاشق و معشوق دونوں کی ہستیاں الگ الگ ہیں اور اپنی اپنی انفرادی حیثیت رکھتی ہیں اسی لئے ان کے یہاں عشق و تمنا کی شدت کے باوصف محبوب سے وفاداری کا وہ تصور نہیں جو مشرقی شاعری کی روایت ہے۔

واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

غالب اپنے اس ذہن اور اپنی منفرد خصوصیات کی بنا پر آہستہ آہستہ جدید ذہن سے بہت قریب آ گئے ہیں۔

غالب کے فکر کی نیرنگیاں، ان کے خیال کی طلسم بندیاں اور ان کے شعور کی گرہ کشائیاں تو ان کے اشعار میں ملتی ہیں لیکن ان کی شخصیت کی پرچھائیاں اور ان کی زندگی جیتی جاگتی تصویر ان کے خطوط میں موجود ہیں اپنے خطوط میں وہ ایک بے لاگ، بے تکلف اور نئے انسان نظر آتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ہی زمانے کے آدمی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کا ذہن غالب کو اپنے سے مختلف محسوس نہیں کرتا۔

ہم کو غالب کی شاعری اور ان کے خطوط میں بجائے سو سال پہلے کے آج کا رنگ اور آج کی تصویر نظر آتی ہے۔

غالب کے زمانہ اور ان کی زندگی پر کام کرنے کی گنجائش ہے لیکن اس ضمن میں معمولی باتوں اور ادنیٰ حقیقتوں پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی چنداں ضرورت نہیں،

مرزا محمود بیگ

غالب سے ملیئے

راوی:۔ جو لوگ اس جہاں سے اُٹھ چکے ہیں، اُن میں کچھ ایسے ہیں، جن کے بارے میں اکثر جی چاہتا ہے کہ کاش اُن کی زندگی میں اُن سے مل سکتے ـــــ
اُن میں ایک غالب بھی ہیں ـــــ
غالب سے اب ملنا تو ممکن نہیں، لیکن آیئے آپ کو اپنے اصحاب سے ملائیں جو غالب سے مل چکے ہیں اور جو اپنی ملاقاتوں کا حال آپ کے لئے لکھکر چھوڑ گئے ہیں یہ حضرت غوث علی شاہ قلندر میر صفیر بلگرامی اور خواجہ عزیز لکھنوی ہیں۔

راوی:۔ پہلے غوث علی شاہ سے ملئے ؛۔
غوث علی شاہ قلندر سلسلۂ قادریہ کے مشہور بزرگ گذرے ہیں، ان کے ملفوظات بہت مشہور ہیں، جن میں اِن بچاسوں مقامات کا ذکر ہے، جہاں جہاں کی انھوں نے سیاحت کی تھی اور بسیوں اُن اصحاب کے نام ملتے ہیں، جن سے اُنہیں ملنے کے مواقع حاصل ہوئے تھے۔
مرزا غالب سے اُن کی ملاقات، زینت المساجد دہلی میں ہوئی جہاں وہ چھ ماہ فروکش رہے ـــــ
اِنؔ ملاقاتوں کا حال انہیں کی زبانی سنئے ؛۔
ایک روز ہم مرزا نوشہ کے مکان پر گئے نہائت حُسن اخلاق سے ملے۔ لب فرش تک آن کر لے گئے تمام حال دریافت کیا۔ ہم نے کہا کہ مرزا صاحب ہم کو آپ کی ایک غزل بہت ہی پسند ہے، علی الخصوص یہ شعر ؎

تو نہ قاتل ہو کوئی اور ہی ہو
تیرے کوچے کی شہادت ہی سہی

مرزا غالب ! صاحب ! یہ شعر تو میرا نہیں کسی استاد کا ہے، شعر نہائت اچھا ہے۔ مَیں نے اِس زمین میں کچھ شعر کہے منر ریں ملاحظ ہو۔
(مرزا غالب ہلکی آواز میں اپنے اشعار سناتے ہیں)

غالب:۔ عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

غوث علی شاہ:۔ جب تک میں دہلی میں مقیم رہا مرزا صاحب نے دستور بنالیا تھا کہ تیسرے دن زینت المساجد میں ہم سے ملنے آتے اور ایک خوان کھانے کا ساتھ لاتے، ہر چند ہم نے عذر کیا کہ یہ تکلیف نہ کیجئے مگر وہ کب ماننے والے تھے، ہم نے ساتھ کھانے کے لئے کہا تو کہنے لگے کہ میں اس قابل نہیں ہوں مے خوار روسیاہ گنہگار مجھکو آپ کے ساتھ کھاتے ہوئے شرم آتی ہے، البتہ اولوش کا مضائقہ نہیں ہم نے بہت اصرار کیا تو الگ طشتری میں لے کر کھایا۔

راوی:۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنؤ سے آئے۔ مرزا نوشہ سے ملے۔ اثنائے گفتگو میں پوچھا۔

رجب علی بیگ! مرزا صاحب ! زبان کس کتاب کی عمدہ ہے۔

غالب:۔ چار درویش کی،

رجب علی بیگ سرور:۔ اور فسانۂ عجائب کیسی ہے ؟

(مرزا غالب قطع کلام کرتے ہوئے کہ)

غالب:۔ اجی لاحول ولاقوۃ اس میں لطیف زبان کہاں! ایک تک بندی اور بھٹیار خانہ جمع ہے،

راوی:۔ اس وقت مرزا کو یہ خبر نہ تھی کہ یہی میاں سرور ہیں۔ جب چلے گئے تو حال معلوم ہوا بہت افسوس کیا اور کہا۔

غالب: ظالمو پہلے سے کیوں نہ کہا

راوی:۔ دوسرے دن مرزا غوث علی شاہ کے پاس آئے اور قصہ سنایا۔

غالب:۔ حضرت یہ امر مجھ سے نادانستگی میں ہوگیا آیئے آج اُن کے مکان پر چلیں اور کل کی مکافات کر آئیں۔،

غوث علی شاہ:۔ ہم اُن کے ہمراہ ہولئے اور میاں سرور کی فرودگاہ پہ پہنچے، مزاج پرسی کے بعد مرزا نے عبارت آرائی کا ذکر چھیڑا اور میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔

غالب:۔ جناب مولوی صاحب رات میں نے فسانۂ عجائب کو بغور دیکھا، اس کی خوبی عبارت اور رنگینی کا کیا بیان کروں، نہایت ہی فصیح و بلیغ عبارت ہے، میرے قیاس میں تو ایسی عمدہ نثر نہ پہلے لکھی گئی نہ آگے لکھی جائے گی اور کیونکر ہو، اس کا مصنف اپنا جواب نہیں رکھتا۔

غوث علی:۔ غرض اس قسم کی بہت سی باتیں بنائیں اپنی خاکساری اور ان کی تعریف کر کے میاں سرور کو نہایت مسرور کیا۔ دوسرے دن ان کی دعوت کی اور ہم کو بھی بلایا اس وقت بھی میاں سرور کی بہت تعریف کی مرزا صاحب کا مذہب تھا کہ دل آزاری بڑا گناہ ہے،

(وقفہ)

غوث علی:۔ ایک دن ہم نے مرزا غالب سے پوچھا۔ مرزا صاحب آپ کو کسی سے محبت بھی ہوئی ؟

غالب:۔ ہاں حضرت علی مرتضی سے، اور آپ کو ؟

غوث علی:۔ واہ صاحب آپ تو مغل بچہ ہو کر علی مرتضی کی محبت کا دم بھریں ہم اُن کی اولاد کہلائیں اور محبت نہ رکھیں۔ کیا یہ بات آپ کے قیاس میں آسکتی ہے ؟

(وقفہ)

راوی :۔ ایک روز غوث علی شاہ قلندر، اپنے مریدین کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے مرزا غالب کے انتقال کی خبر سنائی ——

غوث علی :۔ اِنّا للہِ و اِنّا الیہ راجعون۔ افسوس ہمارے یہ دوست بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے نہایت خوب آدمی تھے، عجز و انکسار بہت تھا فقیر دوست بدرجہ غایت اور خلیق از حد تھے۔ اور فن شاعری میں تو اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ایک روز ہم اُن کے پاس گئے تو انھوں نے اپنا یہ قطعہ سنایا۔

(غوث علی شاہ یہ فارسی قطعہ مدھم آواز میں گنگناتے ہیں)

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار
ساقی و مغنی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند
حق را بہ سجودے و نبی را بہ درودے

(کسی ساز کی آواز)

(وقفہ)

راوی :۔ میر صغیر بلگرامی کے بزرگوں کا وطن بلگرام تھا خود ان کی ولادت مارہرہ میں ہوئی، لیکن پانچ ہی برس کی عمر میں بہار کے مردم خیز قصبہ آرہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔

کم عمری میں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ پندرہ برس کے تھے کہ قدرؔ بلگرامی کے شاگرد ہوئے بیس برس کے تھے کہ امان علی سحرؔ کے شاگرد ہوئے، پچیس سال کی عمر میں مرثیہ گوئی کا شوق پیدا ہوا اور دبیرؔ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔

۱۲۸۰ھ کے لگ بھگ فارسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس رشتے سے کہ صاحبِ عالم مارہروی آن کے نانا تھے۔ وہ مرزا غالب کے شاگرد ہوئے اور ۱۲۸۲ھ میں ایک لمبا سفر کر کے مرزا غالب کی خدمت میں پہنچے اور ڈھائی ماہ تک اُن کے پاس مقیم رہے آپ اِن سے مرزا غالب کی ملاقات کا حال سنیئے۔

صفیر بلگرامی :۔ ۱۲۸۰ ہجری میں میں اپنے نانا حضرت صاحبِ عالم مارہروی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہاں حضرت غالب کا چرچا اور اُن کا ذکر بہت پایا۔ نانا صاحب سے اور غالب سے ایک ربطِ خاص تھا۔ مگر لطف یہ کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں اور عریضہ چند غزلوں کے ساتھ مارہرہ سے روانہ کیا۔

حضرت غالب نے آٹھویں دن جواب میرے خط کا بھیجا اور غزلیں اصلاح دے کر واپس کر دیں۔ اس وقت سے خط و کتابت رہی، یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار دہلی چلنے کی تحریک کی، اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانہ دہلی ہوا،

آموں کا موسم تھا۔ حضرت صاحب عالم نے اپنے باغ کے آم کا ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیئے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔ شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہوا محلہ بلی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے۔ گرمی کے دن تھے، صفر کا مہینہ تھا۔ حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا۔ پاجامہ سیاہ بوٹے دار، دریس کا کلی دار نیمہ سرخ قند کا، بدن پر مرزائی۔ سر کھلا ہوا، سرخ و سفید رنگ، داڑھی

دو اُنگل کی۔ بڑی آنکھیں، قد لمبا، ولایتی چہرہ، آنکھوں میں نُور موجود تھا، کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔ ماموں حضرت شاہ عالم صاحب کو دیکھتے ہی بشاش ہو گئے۔ اس بعد میں سامنے موجود تھا، پوچھا۔

غالب:- شاہ صاحب آیئے، آیئے آپ کا مزاج اچھا ہے اور یہ آپ کے ساتھ کون صاحب ہیں۔

صفیر بلگرامی:- میں ہوں آپ کا نیاز مند اور حلقہ بگوش صفیر،

شاہ عالم:- یہ میرے بھانجے فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں، آپ کی زیارت اور اشعار پر اصلاح لینے کے لئے مارہرہ سے حاضر ہوئے ہیں۔

غالب:- کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری زیارت، میں عاصی، مئے خوار رو سیاہ۔ یہ تو میرے مخدوم اور میرے دوست روحانی کے فرزند ہیں۔ رہا اصلاح اشعار تو اس واقع کو میں نے یوں سمجھ لیا ہے کہ میں مولیٰ علی کا بڑھا غلام ہوں جنھوں نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحبزادے کو میرے سپرد کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر، ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں۔

صفیر بلگرامی:- نانا صاحب آپ کو اکثر یاد فرماتے رہتے ہیں۔

غالب:- ان کا کرم ہے، مہربانی ہے۔ حضرت اب کیسے ہیں۔ بہت دنوں سے اُن کا کوئی والانامہ تشریف نہیں لایا۔

صفیر:- اچھے ہیں۔ اپنے معمولات کے علاوہ خانقاہ کی ذمہ داریوں کی وجہ سے بہت مشغول رہتے ہیں۔ آپ نے مارہرہ آنے کا اُن سے وعدہ کیا تھا انھوں نے یاد دہانی کے لئے مجھے چلتے وقت کہہ دیا تھا۔

غالب:- خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا مقصد مجھے یاد دلاتے ہیں ان دنوں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی۔ شیخ محسین الدین مرحوم سے بطریق تمنا کہنا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ اور وہ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف رغبت، نہ معدہ میں اتنے آموں کی گنجائش۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں، اتنے آم کھاتا تھا پیٹ بھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی کھاتا ہوں مگر دس بارہ اگر پیوندی آم بڑے ہوتے تو پانچ سات۔

(غالب ایک ٹھنڈی سانس بھر کر یہ شعر پڑھتے ہیں) ؎

دریغا کہ عہدِ جوانی گذشت
جوانی مگو زندگانی گذشت

صفیر بلگرامی:- حضرت صاحبِ مارہروی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

غالب:- آؤ ہم تم حضرت صاحب عالم کے پاس چلیں اور اپنی آنکھیں اُن کے کفِ پائے مبارک سے مَلیں۔ میں سلام کروں گا تم بتانا کہ غالب یہی ہے۔ اہلِ دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے۔ میں نے عرض قدم بوسی کیا۔ پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا، فرماتے ہیں "غالب تو اچھا ہے"۔

عرض کرتا ہوں کہ الحمد اللہ، حضرت کا مزاجِ مقدس کیسا ہے، ارشاد ہوا۔ مولوی سید برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔ جناب یہ اُن کی خوبیاں ہیں، میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری

کا حال کہتے۔ ضعفِ قویٰ و اضمحلال کی کیفیت سناتے
تاکہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا۔ ان کی غمخواری اور
دردمند نوازی کا دم بھرتا

(وقفہ)

اب اس موسم میں سفر کیا کرو۔ دل حضرت کے دیکھنے
کے واسطے متحمل رنجِ سفر ہوں گا تو جاڑے میں اس برسات
میں نہیں۔

اے دائے زمحرومیِ دیدار دگر ہیچ

(قدموں کی آہٹ کلو وارد غیرہ آتا ہے)

کلّو:۔ سرکار۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب تشریف لائے
ہیں۔

غالب:۔ اُنہیں لے آؤ۔ اور دیکھو حقہ ٹھنڈا ہو گیا ہے، دوبارہ
چلم بھر دو،

صفیر بلگرامی:۔ نواب ضیاء الدین صاحب تشریف لے آئے
حضرت نے مجھے ان سے ملایا۔ وہ بھی وجیہہ آدمی،
رئیسوں کی وضع پر تھے۔ کرتا پہنے، خلط دار پاجامہ، سر پر
ٹوپی، جریب ہاتھ میں۔ حضرت نے اُن سے میرا حال کہا
اور فرمایا یہ میری ملاقات کو کم رہ سے آئے ہیں۔ اس کے
بعد کچھ ان سے سرگوشی ہوئی۔ جب وہ اُٹھ گئے اور دوپہر
قریب ہوئی تو حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ماموں
کو اپنا تمام مکان دکھایا۔ ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے
تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لئے اور یہ فلاں کام کے واسطے،
آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے۔ ہم لوگ بھی
ساتھ تھے۔ اُوپر جا کر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور
اس کے کونے پر ایک کرہ گلی کے رُخ بنا ہوا تھا۔

غالب:۔ یہ دیکھئے، یہ میری فرودگاہ۔ یہ یہی میرے بیٹھنے،
اُٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے۔ بلامبالغہ
کہتا ہوں کہ یہاں آدھی رات تک دھوپ رہتی ہے۔

(ہنستے ہیں)

غالب:۔ آپ سمجھے۔

صفیر:۔ جی ہاں۔ یعنی گرمی کے دن میں دہلی کی گرمی۔
اور تمازتِ آفتاب سے در و دیوار اس قدر ــــــ

غالب:۔ جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو
ہوتی ہے۔

(دونوں ہنستے ہوئے زینے سے اُترتے ہیں)

غالب:۔ اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے
مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں۔
اس لئے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد
کے قریب ہے آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ گو
تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا۔

صفیر:۔ میں تو آپ سے قریب ہی رہنا چاہتا تھا۔

غالب:۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں۔

(پکارنا) کلو

(خاموشی۔ وقفہ)

کلو، نیاز علی۔ ارے تم سب کہاں چلے گئے

نیاز علی:۔ (دور کی آواز) آیا سرکار)

(نیاز علی ہانپتا ہوا آتا ہے)

نیاز علی:۔ جی سرکار،

غالب:۔ ان لوگوں کو ضیاء الدین خاں کے مکان
تک پہنچائیے۔

صفیر:۔ نواب صاحب کا مکان عالی شان تھا۔ ایک
پھاٹک سڑک کے کنارے جس پر ایک بنگلہ
خوشنما بنا ہوا۔ اس کے اندر ایک خانہ باغ ترو
تازہ اس کے بعد ایک ایوان عالیشان۔ فرش و فروش

سے آراستہ سجا سجایا، غرض بہت خوب مکان تھا ٹھہرنے
کو ہم سب چھ آدمی تھے اس مکان کے ایک کونے
میں سما گئے۔ ابھی اچھی طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ
پانچ خوان جن پر خوان پوش خوش نما پڑے تھے آئے
معلوم ہوا کھانا ہے۔ بہت مزہ دار اور خوش گوار
تھا، قورمہ، قلیہ، شیرمال۔ پلاؤ۔ زردہ، شیر برنج
متجن، کباب پراٹھا سب کچھ تھا، ایک خوان میں کچھ آم
بھی تھے۔ کھانے کے بعد آم جو کھانے بیٹھا صورت حرام
نظر آئی بالکل کھٹے، میں پورب کے آم کھائے ہوئے
تھا بڑی نفرت ہوئی۔ اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے
اس سے کہیں بہتر پائے، پھر تو میں نے نصف ٹوکرا
حضرت غالب کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے
تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا
آخری مصرعہ مجھے یاد رہ گیا ہے۔

کھانا نہ اِسے کہ یہ پدائے ہیں آم
اور سب آم منگا لیجئے۔

صفیر:۔ ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے
اور میں قریب ہی کے حاضر تھا بولے۔
غالب:۔ کیوں حضرت۔ برف کا پانی پیوگے۔
صفیر:۔ کوثر کا پانی ہو تو پلوائیے۔
غالب:۔ (ہنستے ہوئے) ضرور ضرور۔ (پکار کر) لڑکے،
نیاز علی۔
نیاز علی:۔ جی سرکار۔ آپ نے مجھے پکارا۔
غالب:۔ ٹھنڈے کوئیں سے پانی لے آؤ۔
صفیر:۔ لیکن حضور نے برف کا پانی کہا تھا۔
غالب:۔ (قہقہہ) برف ہی کا ہے میر صاحب،
برف ہی کا ہے۔
(وقفہ — صفیر کا پانی پینا)

صفیر:۔ واقعی بہت سرد ہے اور بہت شیریں ہے۔
غالب:۔ یہاں ایک کنوآں ہے جس کے سامنے دریائے
کوسی بیچ ہے اس کا پانی صاف و شفاف، ہلکا شیریں
اور نہایت سریع الہضم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ اس کی سوتیں کوثر و تسنیم سے جا کر مل گئی ہیں۔
راوی:۔ ایک دن مرزا صفیر سے کہنے لگے۔
غالب:۔ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں
کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لئے معمولی پلاؤ،
قورمہ، شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہوگا۔ آج میرا کھانا
بھی آپ دیکھ لیجئے۔
صفیر:۔ گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا،
ایک دسترخوان بچھایا گیا اس پر ایک چینی کے پیالے
میں شوربا اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت
کی بوٹیاں اور ایک رکابی میں تین پھلکے اور ایک رکابی
تانبے کی خالی، پھر مرزا کے ایک رفیق آکر بیٹھے انھوں
نے پھلکوں کے کنارے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کئے اور خالی
رکابی میں رکھے پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور شوربا
لے کر اِن ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی
طرح بنا کر لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ
دیا۔ اِتنے میں حضرت پلنگڑی سے اُترے اور
دسترخوان پر آبیٹھے، پہلے وہ دونوں لقمے نوش جاں
فرمائے اس کے بعد آدھ پیالہ شوربا پی گئے بعد اس
کے دو پھلکوں کے دو چھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے
اس پر بقیہ شوربا پی لیا اور کھانا ختم کر دیا۔
غالب:۔ لو بھائی کھانا ختم ہوا بس میری غذا یہی ہے شب
کو پاؤ بھر بادام نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔
(وقفہ)

صفیر :- ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپیہ دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا وہ میلا بھی قابلِ دید تھا دہلی کا میلا کیا کہنا ہے، جامع مسجد کو دیکھا تبرکات کی زیارت کی۔

چوک کی سیر روز کرتا تھا، بازاروں میں پھرتا تھا مگر دہلی عجیب مقام ہے جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں، چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو۔

کسی نے کبھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو کہاں کے رہنے والے ہو۔ ایک دن مرزا غالب مجھے مولوی صدرالدین صاحب آزردہ کے پاس لے گئے،

خواجہ امان صاحب مترجم بوستانِ خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے۔

دو مرتبہ مشاعروں میں، غرض دہلی میں کئی ماہ رہا اور خوب سیر کی۔ حضرت غالب سے بہت فیض اٹھایا اور اُن کی صحبت سے بہت لُطف اندوز ہوا،

رمضان ۱۲۸۲ ہجری میں میں آرہ چلا آیا جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے خط و کتابت جاری رہی۔

(وقفہ)

راوی :- ایک دن مرثیہ کا ذکر ہو رہا تھا۔ انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری پر گفتگو تھی میر صفیر نے کہا۔

صفیر :- حضرت آپ نے اپنے مرثیے کبھی نہیں سُنائے،

غالب :- بھائی میں مرثیہ نہیں کہتا یہ حق مرزا دبیر کا ہے دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

صفیر :- آپ نے ایک مرثیہ کہا تو تھا نانا صاحب کی زبانی مارہرہ میں اس کا ذکر سُن چکا ہوں۔

غالب :- ہاں ایک مرثیہ شروع کیا تھا تین بند کہہ کر دیکھا تو دا سوخت ہو گیا۔ ہم سے آگے نہ چلا ناتمام رہ گیا۔

صفیر :- دو تین ہی بند سہی ارشاد فرمائیں ہم لوگ اِس کے بڑے مشتاق ہیں۔

غالب :- بھئی وہ بہت پہلے کا کہا ہوا ہے اور میں اس میدان کا آدمی نہیں، مدت سے کسی کو سُنایا بھی نہیں خیر،

(وقفہ)

دیکھو خدا کرے یاد آجائیں، (کچھ سوچتے ہیں اور گنگناتے)

غالب :- اے دجلۂ خوں ......

اب گھر کو بغیر آگ لگائے ...... (رُک کر جیسے اشعار یاد آگئے ہوں)

ہاں لیجئے یاد آگئے ۔۔۔

(غالب ہلکے اور مدھم ترنم میں پڑھتے ہیں۔ اِس طرح کہ سارے الفاظ الگ الگ سمجھ میں آتے ہیں)

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم، لبِ عیسٰی پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تاب سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دین کے ہے سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نہ پایہ جو مدت سے بچا ہے

کیا خیمۂ شبیر سے رُتبہ میں سوا ہے
کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشہ ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہوگا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اِس رو سے کہ وہ برق نہیں ہے
(کسی ساز کی آواز)
(وقفہ)

راوی :۔ خواجہ عزیز الدین فارسی کے بڑے باکمال شاعر تھے ۔ بزرگوں کا وطن کشمیر تھا لیکن بچپن ہی میں لکھنؤ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ خواجہ نے کشمیر کا سفر متعدد بار کیا تھا ایک سفر کے دوران میں دہلی میں مرزا غالب سے بھی ملاقات کی تھی ۔ اس ملاقات کا حال اُنہیں کی زبان سے سُنیئے ——

خواجہ عزیز لکھنوی :۔ ایک مرتبہ ہم لکھنؤ سے کشمیر جا رہے تھے اتفاق سے کچھ دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے ۔ سرائے میں قیام کیا ۔ پھر اسٹیشن پر جانے کے لئے بگھی منگوائی ، ابھی بگھی آ ہی رہی تھی کہ یکا یک ہم کو خیال ہوا کہ حسنِ اتفاق سے دہلی آنا ہوا ہے تو مرزا غالب سے بھی ملاقات کر لینی چاہیئے ۔ فوراً بلی ماروں کا محلہ دریافت کر کے جانے کو مستعد ہوتے کچھ دُور چل کر لوگوں سے پتہ دریافت کیا اتنے میں ایک صاحب ملاقاتی مل گئے ۔ کہنے لگے چلیئے میں مرزا صاحب سے ملاقات کرا دوں ۔
مرزا صاحب کا مکان پختہ تھا ایک بڑا پھاٹک تھا جس کی بغل میں ایک کمرہ اور کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اِس پر ایک نحیف الجثہ آدمی گندمی رنگ اسی بیاسی برس کے ضعیف العمر لیٹے ہوئے ایک کتاب سینے پر رکھے ہوئے آنکھیں گڑائے ہوئے پڑھ رہے تھے یہ مرزا غالب دہلوی ہیں جو غالباً دیوانِ قاآنی کا ملاحظہ فرما رہے ہیں ۔

خواجہ عزیز :۔ ہم نے سلام کیا لیکن بہرے اس قدر تھے کہ کہ اُن کے کان تک آواز نہ گئی ۔ آخر کھڑے کھڑے واپس آنے کا قصد کیا تھا کہ غالب نے چارپائی کی پٹی کے سہارے سے کروٹ بدلی اور ہماری طرف دیکھا

خواجہ عزیز لکھنوی :۔ آداب عرض کرتا ہوں قبلہ ۔

غالب :۔ تسلیمات ۔ آیئے آیئے ۔ آپ کو آئے ہوئے دیر تو نہیں ہوئی ۔

خواجہ عزیز :۔ جی نہیں ۔ آپ کے آرام میں مخل ہوا ،
(غالب قطع کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں)

غالب :۔ بھائی آنکھوں سے سوجھتا ہے لیکن کانوں سے بہت کم سُنائی دیتا ہے ۔

خواجہ عزیز :۔ مرزا غالب نے ہم لوگوں کا نام و نشان پُوچھا پھر کہا ۔

غالب :۔ مجھ سے ملنے آئے ہو تو ضرور کچھ نہ کچھ کہتے ہوگے کچھ اپنا کلام بھی سُناؤ ۔

خواجہ عزیز :۔ ہم لوگ تو آپ کا کلام آپ کی زبانِ مبارک سے سُننے کی غرض سے آئے تھے ۔

غالب :۔ خیر مجھ سے سُن لینا پہلے اپنے شعر تو سُناؤ ۔

خواجہ عزیز :۔ بہتر ہے حکم کی تعمیل کرتا ہوں ۔
(خواجہ عزیز یہ شعر تحت اللفظ پڑھتے ہیں)

خواجہ عزیز :۔ مہ مصر است داغ از رشک مہتابے کہ من دارم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

غالب :- یہ مصرا ست داغ از رشک ہتابے کہ من دارم،
بھی خوب، لیکن، یہ مصرع نئی ترکیب ہے، یہ کنعاں
تو سُنا ہے، یہ مصر، سننے میں نہیں آیا۔

خواجہ عزیز :- قبلہ صائب کہتا ہے۔

ز صد ہزار پسر ہم چو ماہِ مصر یکے
چناں شود کہ چراغِ پدر کند روشن

غالب :- بہت خوب، کیا پیارا مطلع نکالا ہے تم نے
(غالب تحت اللفظ عجیب لطف اور مزے سے اس مطلع
کو پڑھتے ہیں)

یہ مصرا ست داغ از رشک ہتابے کہ من دارم
زلیخا کو رشد از حسرتِ خوابے کہ من دارم

(جب مرزا غالب دوسرا مصرعہ ختم کرنے کے قریب ہوتے
ہیں تو غالب کی ملازمہ بی وفادار کے قدموں کی چاپ
سنائی دیتی ہے)

بی وفادار :- سرکار، بیگم صاحبہ انتظار کر رہی ہیں۔ خاصہ دیر
سے تیار ہے۔

مرزا غالب :- بی وفادار۔ اب تو کھانا یہیں بھجوا دو۔

خواجہ عزیز :- حضرت زحمت نہ فرمائیے۔ اب ہمیں
اجازت دیجئے۔

غالب :- ابھی آئے اور ابھی چل دیئے۔ تشریف تو رکھئے

خواجہ عزیز :- پھر کبھی حاضر ہوں گے۔ آج صرف تھوڑی
دیر کے لئے دہلی اُتر پڑے تھے۔ ریل کا وقت
بالکل قریب ہے اور بگھی سرائے میں کھڑی ہے اسباب
بندھا ہوا رکھا ہے، پا بہ رکاب آپ سے ملنے آئے
تھے، اب اجازت چاہتے ہیں۔

غالب :- آپ کی غایت اس تکلیف فرمائی سے یہ تھی کہ
میری صورت اور کیفیت ملاحظہ فرمائیں۔ ضعف
کی حالت دیکھی کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار ہے، بصارت
کی حالت دیکھی کہ آدمی کو پہچانتا نہیں ہوں۔ غزل
پڑھنے کا انداز ملاحظہ کیا۔ کلام سنا، اب ایک بات
باقی رہ گئی ہے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کتنا کھاتا ہوں
اس کو بھی ملاحظہ کرتے جائیے۔

خواجہ عزیز :- اتنے میں کھانا آگیا۔ دو پھلکے اور ایک طشتری
میں بھنا ہوا گوشت جس میں کچھ میوہ بھی پڑا ہوا تھا،
پھلکے کا باریک پرت لے کر دو چار نوالے بمشکل
کھاتے اور کھانا بڑھا دیا۔ اب دیر ہو چکی تھی،
ہم لوگوں نے اجازت لی اور رخصت ہو گئے۔

کسی ساز کی آواز

(فیڈ آؤٹ)

راوی :- مرزا غالب، جہاں حد درجہ منکسر المزاج تھے،
وہاں خود دار بھی حد درجہ تھے۔ وفات سے کچھ
سال پہلے آپ نے خود اپنی تاریخ وفات "غالب مُرد"
کہی تھی جس کے اعداد ۱۲۷۷ بنتے تھے۔ جب
کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ——— تو آپ
نے توجیہہ کی کہ ۱۲۷۷ھ میں وبا کی وجہ سے
بہت سے لوگ مر رہے تھے۔ اس سال
مرنا مناسب نہ سمجھا،

آخر ۷۳ سال تک اُردو شاعری کا یہ آفتاب
اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک کر ۱۲۸۵ھ
مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو غروب
ہُوا ۔

قمر رئیس　　　　　ایکانکی تمثیل

مرزا غالب دلّی کالج میں

[صد سالہ برسی کی تقریب پر]

کردار :-

١- غالب :- لگ بھگ ٥٥ کا سن۔ خوبرو۔ خوش قد۔ بھری بھری کھچڑی داڑھی۔ روشن۔ گہری، خمار آلود آنکھیں، سفید پاجامہ۔ سفید انگرکھا۔ اس پر جامہ دار کا چغہ، سر پر پوستین کی وہی لمبی ٹوپی جو معروف تصویر میں ملتی ہے ـــ

٢- فہیم :- بیس بائیس سال کا متین طالب علم۔ مغربی لباس ہیں۔

٣- شاہینہ :- اٹھارہ انیس سال کی ہنس مکھ شوخ طالبہ، نئے فیشن کی رنگین ساری میں۔

٤- لالہ کشن چند :- ایک بیوپاری اور مل مالک، فربہ اندام کھدر کے لباس میں،

٥- پھول چند :- کشن چند کا سولہ سترہ سالہ لڑکا۔ قیمتی مغربی لباس میں،

٦- اندھا فقیر :- خوش گلو۔ کاسہ لئے، چیتھڑے پہنے، ضعیف سفید بال،

٧- فقیر لڑکی، بارہ تیرہ سال کا سن، بال اجڑے ہوئے چیتھڑے پہنے، مذرق برق لباس پہنے دو لڑکیاں، دو نوجوان طالب علم ٹیڈی لباس میں ـــ ایک موٹر سائیکل ـــ

منظر :-

شاداب سبزہ زار کا ایک گوشہ، ارد گرد چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں رنگ برنگے انگریزی پھول کھلے ہیں۔ پس منظر میں قدیم طرز کی ایک بوسیدہ سی عمارت کا ایک حصہ نظر آتا ہے، عمارت اور اس شاداب گوشہ کے درمیان ڈیڑھ گز چوڑی ایک روش یا راستہ ہے۔ پردہ ہٹتا ہے تو مرزا غالب، جن کے دائیں بائیں فہیم اور شاہینہ ہیں دائیں جانب سے داخل ہوتے ہیں۔

فہیم :- لو مرزا صاحب! یہ ہے ہمارا کالج ـــ دلّی کالج ـــ

(مرزا حیرت اور پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں)

شاہینہ :- (گھڑی دیکھتے ہوئے) ابھی جلسہ شروع ہونے میں دیر ہے مرزا صاحب، سوچا تب تک آپ کو اپنا کالج دکھا دیں اور کچھ باتیں بھی ہو جائیں۔

غالب :- شاہینہ بیگم! میرے حواس بجا نہیں۔ باتیں کیا کروں؟ تم لوگ کہتے ہو یہ دلّی کالج ہے، کیسی دِلّی، کہاں کا کالج؟ میں نے کبھی کہا تھا کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دُنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں سو دی جا رہی ہے ....

شاہینہ :- (ہنستے ہوئے شوخی سے) اور بار بار دی جا رہی ہے مگر آج کل مرزا صاحب آپ نے جنّت میں کون سے

گناہ کر ڈالے ـــــ؟

غالب:۔ گناہوں کی نہ پوچھو، دو چار ہوں تو گناؤں۔

شاہینہ:۔ (ہنستے ہوئے) وہی خدا اور فرشتوں سے تکرار، لاکھوں برس کی حوروں سے بیزار، اور سب سے بڑا گناہ تو آپ کی وہ تجویز ہوگی جو آپ نے خدا کے حضور رکھی ہوگی ـــــ

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غالب:۔ ہاں بی بی! سچ پوچھو تو وہاں دم گھٹتا ہے

فہیم:۔ خیر مرزا صاحب! یہ کہئیے آپ کو ہمارا کالج پسند آیا؟

غالب:۔ میاں! کیا تماشہ ہے؟ یہ اجمیری دروازے کا علاقہ ہے کہتے ہو دلی کالج ہے، کیا یہ وہی کالج ہے جہاں مولانا صہبائی، مولوی مملوک علی اور بھائی رام چندر درس دیتے تھے اور جہاں پیارے لال اور نذیر احمد اور ناظر بنسی دھر کے پوتے شیو نرائن پڑھتے تھے۔

فہیم:۔ مرزا صاحب! وہ کالج تو غدر میں آپ کے سامنے ہی مرحوم ہو گیا تھا۔ یہ نیا دلی کالج ہے۔ جو فرنگیوں سے آزادی پانے کے بعد وجود میں آیا۔

شاہینہ:۔ سنا ہے دلی کالج میں آپ کو کبھی نوکری کی پیشکش ہوئی تھی لیکن جب انگریز بہادر آپ کے استقبال کو باہر نہ آئے تو آپ تنک کر ان کی ڈیوڑھی سے لوٹ گئے۔

غالب:۔ تم تو جانتی ہو ہماری بے دماغی۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

دیکھ کر، مگر بھائی۔ غدر کی تباہی کو یاد کر کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

فہیم:۔ مرزا صاحب! آپ کو یاد نہیں۔ غدر میں دلی اور لکھنؤ کی تباہی پر آپ نے خود ہی میاں داد خاں سیاح کو لکھا تھا کہ اس فساد کے بعد وہاں راہیں وسیع ہوں گی، بازار اچھے نکل آئیں گے۔ رونق بڑھے گی اور جو دیکھے گا وہ داد دے گا۔

غالب:۔ داد تو میں بھی دے رہا ہوں۔ مگر بھائی سچ یہ ہے کہ دلی کالج کے ذکر سے مجھے تو اپنا زمانہ اور اپنے دوست یاد آگئے، ہائے ـــــ کیا لوگ تھے! کیا وضعداری تھی!

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کئے؟

شاہینہ:۔ مرزا صاحب! آپ تو خود ہی اپنے اس سوال کا جواب دے چکے ہیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہوگئیں

غالب:۔ (تبسم کے ساتھ مڑ کر دیکھتے ہوئے)

ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں)

(اتنے میں پیچھے کی روش پر دو نازک اندام خوش پوش لڑکیاں دو نوجوان لڑکوں کے ساتھ ہنستی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ غالب قدرے مڑ کر انہیں گذرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

شاہینہ:۔ (شوخی سے) مرزا صاحب کیا جنت کی حوریں یاد آرہی ہیں؟

غالب:۔ (شاہینہ کو دیکھتے ہوئے)

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچہ سے بہشت
یہی نقشہ ہے، ولے اسقدر آباد نہیں

(شگفتہ رو ہو کر) ہائے اس جہانِ رنگ و بو میں کیسی رونق ہے! کتنی دلبری ہے، یہ سبزہ زار مطرّا، یہ ناز نینان خود آرا، یہ صبر آزما نگاہیں، یہ جھومتی گاتی راہیں ..... یہ مستی اور آزادی، یہ چہچہے اور قہقہے ...... سچ مچ

یہ دنیا کتنی جوان ہوگئی ہے۔ یہ زندگی کتنی خوبصورت
بن گئی ہے۔
(چند لمحوں کے وقفہ کے بعد پیچھے کی روش پر، اچانک ایک
نوجوان بھاری موٹر سائیکل پر تیز رفتاری سے گزر جاتا
ہے۔ اس کے پیچھے خوبصورت لباس میں ایک لڑکی
بیٹھی ہے۔ غالب اسے دیکھ کر پہلے جھجکتے ہیں اور پھر اپنے
دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیتے ہیں...... پس منظر میں موٹر
سائیکل کی ہلکی ہلکی آواز آتی رہتی ہے)
غالب :- میاں یہ کیا فتنہ وفساد ہے؟ یہ کون جلاد ہے
جو آہنی گھوڑے پہ پریزاد کو اڑائے لئے جارہا ہے؟
شاہینہ :- (ہنستے ہوئے) مرزا صاحب ۔۔۔۔۔! ہ
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے
یہ ہمارے کالج کے طلباء ہیں۔
غالب :- توبہ! توبہ! اس شور سے میرے کان پھٹے
جارہے ہیں۔
شاہینہ :- مگر گستاخی معاف مرزا صاحب! آپ تو بہرے
ہیں۔ یاد نہیں آپ نے کہا تھا۔
بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
غالب :- وہ تو تمہارے لئے تھا۔ مگر اس قیامت کے شور
میں تو کمبخت بہرے بھی دیوانے ہوجائیں گے۔
فہیم :- مرزا صاحب! یہ خودکار اور تیز رفتار مشینوں کا
صنعتی دور ہے۔ اس میں شور تو ہوگا ہی ....
غالب :- ہاں میاں ۔۔۔!
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
اگر یہ رنگ ونکہت، یہ مطرب دے میسر ہوں، تن من
آسودہ ہو، تو شور بھی گوارا ہوجائے گا۔
(بائیں جانب سے لالہ کشن چند اپنے لڑکے کے ساتھ
داخل ہوتے ہیں)
فہیم :- (تعارف کراتے ہوئے) آپ سے ملئے مرزا صاحب!
یہ ہیں لالہ کشن چند ۔۔۔۔۔ دلی کے بہت بڑے
بیوپاری اور کپڑا مل کے مالک ۔۔۔۔۔ اردو زبان
اور آپ کے کلام پر جان دیتے ہیں۔ آپ کی صد سالہ
برسی کی تقریب منانے کے لئے لالہ جی نے چالیس
ہزار روپیہ دیا ہے۔
[لالہ جی تعریف سن کر اس طرح خوش ہوتے اور
گھگھیا کر مسکراتے ہیں کہ دانت نکل آتے ہیں،
بڑھ کر غالب سے مصافحہ کرتے ہیں]
غالب :- کہئے لالہ جی! کیسا کپڑا بناتے، کتنا کماتے ہیں
آپ ۔۔۔؟ بھئی دلی والے اسی لئے امیر اور خوش
پوشاک نظر آتے ہیں۔
کشن چند :- اجی کا پوچھو ہو مرجا صاب! سب اوپر والے
کی کرپا ہے۔ مہینا ماں یہی کوئی دس پندرہ لاکھ
روپیا کا کپڑا امترجات ہے آپ کی دیا سے۔
غالب :- (حیرت سے) دس پندرہ لاکھ (ٹھہر کر) مگر
لالہ جی یہ جو آپ بول رہے ہیں یہ دلی کی زبان
تو نہیں ۔۔۔!
کشن چند :- ہاں مرجا صاحب! اس بیوپار میں تو
جبان کا بھی ستیاناس ہوگیا آپ کی دیا سے اور
پھر ہم بڑھے لکھے بھی نا ہیں ۔۔۔۔۔ یہ میرا لڑکا ہے
پھول چند ۔۔۔۔۔ یہ آپ کا گدھے اور آم والا
مجاکیہ کِسّہ سناتا ہے اور آپ کی کوِیتا بھی گاتا ہے
آپ کی دیا سے۔
[غالب سراپا حیرت لڑکے کی طرف دیکھتے ہیں]
پھول چند :- مرجا صاحب! وہ جو شرّیا نے آپ کی

غزل گاتی ہے ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

بڑی سُندر کویتا ہے۔ پرنتو اس کا ارتھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ "وصالِ یار" کس وستو کو کہتے ہیں؟

[غالب بہت بے مزہ اور برہم ہو کر لالہ جی اور لڑکے کی طرف دیکھتے ہیں۔ اتنے میں باہر سے مجمع کی آواز اُبھرتی ہے۔ لوگ نعرے لگا رہے ہیں]

کشن چند ——— مُردہ باد
اپنی مانگیں ——— لے کے رہیں گے
مہنگائی بھتّہ ——— دینا ہوگا
روٹی کپڑا ——— حق ہے اپنا

غالب:- یہ کون لوگ ہیں ———؟

فہیم:- یہ لالہ جی کے کارخانے کے مزدور ہیں،

کشن چند:- (گھبرا کر) یہ ہتیارے یہاں بھی آمرے، اچھا مرزا صاب! ہمیں آگیا دیجئے۔ کل کے جلسہ میں بھینٹ ہوگی آپ کی دیا سے۔

[لالہ جی لڑکے کے ساتھ دائیں دروازے سے نکل جاتے ہیں]

غالب:- یہ مزدور کیا چاہتے ہیں؟ یہ سب کیا ہے؟

شاہینہ:- یہ جینا چاہتے ہیں مرزا صاحب! انہیں روٹی کپڑا چاہیئے۔

غالب:- مگر یہ تو بارزگار ہیں۔ کارخانے میں کپڑا پیدا کرتے ہیں۔

فہیم:- جی ہاں! مگر وہ کپڑا اور اس کا منافع ان کے لئے نہیں ہے ———،

غالب:- (چہرہ پر کرب انگیز فکر) تو یہ بھوکے ہیں، ننگے ہیں...... بدحال اور بدنصیب انسان!!

[خلا میں گھورتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں]

سوچا تھا اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے، نہ سہی، جس شہر میں میں رہوں اُس شہر میں تو کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے.....
اس بھوک، اس عریانی اور بے سروسامانی سے کب ملے گی نجات انسان کو؟ کب اس کے دُکھ دُور ہوں گے، کب اس کا مقدر پھرے گا ———
ایک صدی بیت گئی اور وہی عذاب اب تک جاری ہے۔ پھر یہ ظاہری چمک دمک کیوں؟ یہ رنگینی یہ ترقی کیسی؟ یہ شدّاد کی جنّت! یہ نمرود کی خدائی! یاالٰہی!! میں یہاں کیوں آیا؟

[ایک اندھا فقیر کاسہ لئے اور بارہ تیرہ سال کی ایک نیم عریاں لڑکی کا شانہ پکڑے غالب کی غزل گاتا ہوا داخل ہوتا ہے]

تینوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں ؎

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

لڑکی:- بابا! ہم بھوکے ہیں۔ کوئی کھانا کھلوا دو ———!

فقیر:- مرزا نوشہ کے صدقہ میں کوئی کپڑ دے دو بابا،

غالب: (چہرہ پہ اذیت اور حیرت) تم کون ہو بابا کہاں رہتے ہو ———؟

فقیر: (درد بھرے لہجہ میں) ہم بھی انسان تھے۔ اہلِ زبان تھے۔ اب لوگ گدا کہتے ہیں...... (سرد آہ بھر کر)

گلی قاسم جان میں ہماری چھوٹی سی حویلی تھی۔ اب کھلے آسمان
کے نیچے بسیرا کرتے ہیں، ہم ہر جگہ رہتے ہیں۔ لیکن
اب ہمارا گھر کوئی نہیں۔

شاہینہ :۔ یہ کس کی غزل گا رہے تھے بابا ۔۔ !

فقیر :۔ مرزا نوشہ کی ...... (یاد کرتے ہوئے) ہمارے
آبا حضور نے جوانی میں ان کو دیکھا تھا۔ مشاعروں میں انکا
کلام بھی سنا تھا۔ سچ کہتے تھے مرحوم، اب اُردو زبان
میں اس پایہ کا شاعر پیدا نہ ہوگا۔

لڑکی :۔ (فقیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے برہمی سے) بابا آگے بڑھو،
یہاں کچھ ملنے والا نہیں۔

(غالب کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار
ہوتے ہیں۔ وہ خاموشی سے آگے بڑھتے اور اپنا چغہ
اُتار کر فقیر کے شانوں پر ڈال دیتے ہیں اور
پھر سر جھکائے آہستہ آہستہ بائیں طرف بڑھنے لگتے ہیں

فہیم اور شاہینہ :۔ (بیک آواز) مرزا صاحب کہاں
جا رہے ہیں ——— ؟

فہیم :۔ ابھی ہمارا جلسہ ہوگا۔

شاہینہ :۔ آپ کا صد سالہ جشن منایا جائے گا۔

[غالب چند قدم چل کر رُکتے اور مڑ کر دیکھتے ہیں]

غالب :۔ (فقیر کی طرف اشارہ کر کے) یہ میری زندگی کا آخری
جشن تھا (رُک کر) وہ ——— میری موت کا جلوس
ہوگا ۔۔

[بائیں طرف سے غالب اور دائیں طرف سے فقیر نکل
جاتے ہیں۔ فہیم اور شاہینہ دکھ اور حسرت سے غالب
کو جاتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں]

پردہ

جاوید وشسٹ

غالب کی حیات و شاعری کا جنسی پہلو

["غالب صدی" کے ہیرو کی حیات و شاعری کے جنسی پہلو" پر روشنی ڈالنے سے قبل ہم غالب کے چند نقادوں کی وہ گراں قدر رائیں پیش کرتے ہیں جو خاص طور پر غالب کے عشق و عاشقی سے متعلق دی گئی ہیں، تاکہ جنسی جبلت اور اس کے خاص واردات اور واقعات کے آئینے میں حیاتِ غالب کی کچھ پرچھائیاں اُبھر آئیں اور مرزا کی سیرت کے بعض گوشے بھی نمایاں ہو جائیں۔

(۱) عشق ایک شدید ترین احساس کا نام ہے۔ بنیادی طور پر یا مرکزی طور پر تو اس کا مخزن یا تعلق جنسیات یا شہوانیات میں ملے گا اور یہاں سے اُبھر کر جذبات اور نفسیات کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا تمام قوائے انسانی اور تمام شخصیت میں یہ احساس یا یہ غیبی تحریک بھر جاتی ہے اور شش جہت سے انسان پہ چھا جاتی ہے۔ بات تو صرف اتنی ہے جو حالی نے کہی بھی ہے ؎

عشق کہتے ہیں جسے سب وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

(۲) غالب آگرے میں رجب ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے، باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد ان کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں نے جو مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبیدار تھے، اُنہیں لاڈ، پیار اور چاؤ سے پالا، بچپن کھیل کود میں گزرا اور جوانی رنگ رلیوں میں[۲]، اس لئے "رفت گیا اور بود تھا" سے آگے تعلیم کا سلسلہ نہ چل سکا، (شاید محمد معظم سے بیعت کی لیکن یہ ایک طرح کی رسم پرستی تھی۔ جب تک رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑتا رہا، ان پر مذہب کا رنگ نہ چڑھا اور بابر کی طرح داد عیش و عشرت خوب دل کھول کر دی۔ خود فرماتے ہیں :-

"جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے، جب کبھی مجھ کو اپنا وہ رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے، جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے، اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے، ناچار مستی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔"

---

(۱) اُردو کی عشقیہ شاعری (فراق گورکھپوری) ص۱۱

(۲) مضمون "غالب خطوط کے آئینے میں" از ڈاکٹر شوکت سبزواری (احوال و نقدِ غالب مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال ص۹۷

(۳) "مرزا کے نانا کی آگرے میں ایک خاصی سرکار تھی جس کی بدولت ان کے ملازم اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے مالگذار بن گئے تھے، اور مرزا کا بچپن اور عنفوانِ شباب بڑے اللے تللوں میں بسر ہوا تھا" یادگارِ غالب، حالی ص۱۱

تہتر برس کی عمر میں دُنیا چھوڑ دی اور ۱۲۸۵ھ میں اپنا یہ شعر
زبانِ حال سے پڑھتے ہوئے سدھارے ۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

(۴۱) غالب کے واقعات زندگی اور ان کے کلام پر غور کرنے
سے ایک بات نمایاں ہو جاتی ہے کہ انہیں دُنیا کی اچھی چیزوں
سے بے حد محبت تھی اور "نسوانی حسن" ان اچھی چیزوں میں شاید
سب سے زیادہ عزیز تھا ۔

اسد بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

غالب کی جوانی جس طرح حسن پرستی میں بسر ہوئی ہے
اس کا اندازہ کئی شہادتوں سے ہو سکتا ہے ۔ نواب عظیم الدولہ
نے ان کی نسبت لکھا تھا :-

"در خاطر متمکن غمہائے عشق مجاز
تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز"

غالب خود اپنی جوانی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

ہر جلوہ زار من بتقاضائے دلبری
از غنچہ بود محمل نازے بہ رہ گزار
ہم سینہ از بلائے جفا پیشہ دلبراں
فرہنگ کاروانئے بیداد روزگار
ہم دیدہ از ادائے مغاں شیوہ شاہداں
فہرست روزنامۂ اندوہ انتظار
شوقم جریدۂ رقم آرزوئے بوس
ذوقم قلمروِ ہوسِ مژدۂ کنار
ہموارہ ذوق مستی و لہو و سرور و سوز
پیوستہ شعر و شاہد و شمع و مے و قمار

ان اشعار کے علاوہ اُردو میں غالب کی ایک نہایت مؤثر غزل
ہے جس کی نسبت یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ محبوبہ کا نوحہ
ہے ۔

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تیری غفلت شعاری ہائے ہائے

غالب کا یہ نوحہ تمام کا تمام بڑے غور و فکر کا مستحق ہے ۔ بعض
اشعار ایسے ہیں جن میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ معلوم
ہوتا ہے ۔

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
شرم رسوائی سے جا چھپنا نقاب خاک میں
ختم ہے اُلفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

پہلا مقطع جسے غالب نے اشاعت کے وقت حذف کر دیا ، بہت
پُر معنی ہے ۔

گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسد
میری دلّی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

یہ نوحہ غالب نے بیس بائیس برس کی عمر میں اس زمانے میں لکھا تھا
جب وہ ابھی اسد تخلص کرتے تھے ، جس محبوبہ کا اس میں ذکر ہے
اسے غالب سے اور غالب کو اس سے بڑی محبت تھی اور شاید
مرزا کی اتنی گہری دلبستگی پھر کسی سے نہیں ہوئی ۔ اس واقعہ کے چالیس
بیالیس بعد مرزا ایک خط میں مرزا حاتم علی مہر کی معشوقہ کی تعزیت

---

(۴۱) غالب کی عشقیہ شاعری از ڈاکٹر ایم اکرام (احوال و نقدِ غالب مرتبہ پروفیسر سیال صفحہ ۳۹۲)

کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"مغل بچے بھی غضب کے ہوتے ہیں جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ میں بھی مغل بچہ ہوں۔ عمر بھر میں ایک بڑی ستم پیشہ ڈومنی کو میں نے بھی مار رکھا ہے خدا ان دونوں کو بخشے اور ہم تم دونوں کو بھی کہ زخم مرگ دوست کھائے ہوئے ہیں، مغفرت کرے، چالیس بیالیس برس کا یہ واقعہ ہے باآنکہ یہ کوچہ چھوٹ گیا اس فن میں بیگانہ محض ہو گیا ہوں لیکن اب بھی کبھی کبھی وہ ادائیں یاد آتی ہیں۔ اس کا مرنا زندگی بھر نہ بھولوں گا۔"

(مظفر حسین خاں کی محبوبہ کی وفات پر) ایک فارسی خط میں یہی آپ بیتی بیان ہوئی ہے۔

غالب کی اس معشوقہ کی وفات کے بعد کسی گہری اور پائدار محبت کے نشان ان کی زندگی میں نہیں ملتے لیکن مخلوقات قدرت میں حسن ڈھونڈنے کی جو خواہش شاعر کے دل میں ازل سے لکھی ہوئی تھی، وہ تمام عمر ساتھ رہی چنانچہ مرزا نے جو فارسی مثنوی "بنارس" کے متعلق لکھی ہے اس میں اپنی "جنت نگاہ" کا نقشہ کھینچا ہے۔

بتان بنارس کی نسبت لکھتے ہیں ؎

میانہا نازک و دلہا توانا
زنادانی بکار خویش دانا

تبسم بسکہ در لبہا طبیعی است
دہنہا رشک گلہائے ربیعی است

ادائے یک گلستاں جلوہ سرشار
خرامے صد قیامت فتنہ دربار

قیامت قامتاں، مژگاں درازاں
ز مژگاں بر صف دل نیزہ بازاں

اسی زمانے میں انھوں نے ایک بڑی مرصع غزل اردو میں لکھی جس میں اپنی حسین و جمیل اُمنگوں کی ایک دلآویز تصویر پیش کی ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس
زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری غالب کے نظریۂ عشق کی نسبت لکھتے ہیں :۔

"گو مرزا غالب کی معشوقہ ایک عارضی (ارضی) عورت ہے ان کا عشق ہوس سفلہ، لذات جرمیہ سے پاک ہے ہوس سفلہ کیا ہے؟ جب روح گیرائی اور قبضہ کی جانب مائل ہوتی ہے تو یہیں پیدا ہوتی ہے، ہوس مطلوب کو اپنے پرشہوت ہاتھوں سے ملوث کرنا چاہتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی رائے کی تائید میں غالب کا ایک شعر کو نقل نہیں کیا۔ ڈاکٹر اکرام کا خیال ہے کہ ڈاکٹر بجنوری کی یہ رائے مرزا کی شخصی نقطۂ نظر کی عین ضد ہے جس خواہش گیرائی کو بجنوری یہاں سفلہ کہتے ہیں غالب اس سے بری نہ تھے۔

غالب نے اپنی جوانی کی جو تصویر کھینچی ہے اس میں ایک شعر ہے ؎

شوقم جریدۂ رقم آرزوئے بوس
ذوقم قلمرو ہوس مژدۂ کنار

بنارس کے متعلق جو مثنوی لکھی ہے اس میں اسی "خواہش گیرائی" کا اظہار بہت صاف صاف ہے ؎

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش
بہار بستر و لورد ز آغوشش
بہ تن سرمایۂ افزائش دل
سراپا مژدۂ آسائش دل

اس میں فقط چشم و دل و جاں کی ضیافت کی خواہش نہیں بلکہ "تن" کا بھی خیال ہے ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

تکلف برطرف، لب تشنۂ بوس و کنار ستم
زراہم بازچیں، دام نوازش ہائے پنہاں را

اور اس طرح کے اشعار کئی ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے غالب کے تصور عشق کے بارہ میں ڈاکٹر بجنوری کی رائے قبول کرنا مشکل ہے جس میں گیرائی کی انھوں نے مذمت کی ہے وہ مرزا کے نزدیک جذبۂ محبت کا لازمی جزو تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ بعض خیال پرست حضرات جس "خالص حسن پرستی" کے مداح ہیں اور جسے ڈاکٹر بجنوری نے غالب کے نظریۂ محبت کی خصوصیت خیال کیا ہے وہ غالب کی فہم سے بالاتر یا دور تر تھی۔ دراصل یہ مصنوعی جذبہ بالعموم ان شعرا کا خاصہ ہے جو "ترک شیرازی" کے فدائی ہیں۔ جو ایسی شراب سے بے خود ہونے کا بہانہ کر رہے ہیں جو نہ خود پی سکتے ہیں اور نہ اوروں کو پلا سکتے ہیں" (۵)

[(۶) جب کوئی شخص اپنے ذہن کو خارجی دنیا سے مطابق کرنے میں ناکام ہوتا ہے تو وہ دو باتوں میں سے کوئی ایک بات اختیار کر لیتا ہے بشرطیکہ وہ مخبوط الحواس نہ بن جائے بلکہ تسکین حاصل کرنے اور اپنی پریشان روح کو آرام پہنچانے کا آرزومند ہو، وہ یا تو بے تحاشا یا چپکے چپکے اپنے آپ کو ایسی ہستی کی آغوش میں دے دیتا ہے جو اس کی آتش محبت کو بھڑکائے اور خود بھی اس کی آگ میں جلنے لگے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنے محبوب کے سوا دنیا میں کوئی چیز اس کی دلچسپیوں کا مرکز نہیں بن سکتی۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو وہ دنیا کی ہر چیز سے منہ پھیر لیتا ہے اور ایک خود ساختہ زندگی بسر کرنے لگتا ہے ....]

اس طرح بعض لوگ اپنی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ محبت کی بارگاہ میں وہ اپنی زندگی کے تمام مصائب کو بھلا دیتے ہیں۔

غالب کو یہ تسکین کبھی نصیب نہ ہوئی۔ شباب کے عالم میں اس کو ایک عورت سے لگاؤ ضرور پیدا ہوا جو شاید بازاری تھی۔ لیکن یہ لگاؤ ابھی "وحشت کا رنگ" پکڑنے نہ پایا تھا کہ وہ اس جہان سے رخصت ہو گئی اور غالب نے غزل کی صورت میں ذیل کا دلگداز مرثیہ لکھا۔ یہ سانحہ اس وقت پیش آیا جبکہ غالب کی منکوحہ بیوی موجود تھیں اور ان کی شادی کو کوئی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا ؎

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوق خواری ہائے ہائے

---

(۵) "افلاطون نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ محبت میں جنسی یا شہوانی یا نفسانی خواہشات یا محرکات کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اسلامی فلسفہ پر بھی افلاطون کے اس نظریہ کا اثر پڑا اور ناکامی اور محرومی اور نامردوں کی، "پاک محبت" شاعری میں تبرک ہو کر رہ گئی، خواجہ درد کہتے ہیں ؎

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانا ، اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

اصل بات کچھ یوں ہے بقول جرأت ؎

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے ، کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

(اردو کی "عشقیہ شاعری"۔ فراق گورکھپوری ص ۳۵)

(۶) غالب کی شاعری ڈاکٹر سید عبداللطیف (احوال و نقد غالب ص ۳۳۳)

اس کے کئی سال بعد مرزا نے یہ اشعار کہے ؎

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

ان سے کسی اور جراحتِ دل کی بو آتی ہے جو سفر کلکتہ سے کئی سال قبل جو غزل لکھی گئی وہ بھی کچھ معنی اپنے اندر ضرور رکھتی ہے۔ بشرطیکہ وہ صرف ذہنی مشق کا نتیجہ نہ ہو ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

بہر حال عشق و محبت کی پہلی سرگزشت کے بعد بھی مرزا نے شاعرانہ طبع آزمائی کی۔ بلکہ وفات کے چند ہی سال پہلے ۶۸ سال کی عمر میں یہ شعر کہے ؎

شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ
ہوا ہے موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ

بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن تکیہ

فروغِ حسن سے روشن ہے خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پروین تو ہے پرن تکیہ

مزا ملے کہو کیا خاک اسپہ سونے کا!
رکھے جو بیچ میں وہ شوخ سیم تن تکیہ

اگرچہ تھا یہ ارادہ مگر خدا کا شکر!
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گل بدن تکیہ

ظاہر ہے ان اشعار میں شاہدانہ محبت حقیقی اور جیتے جاگتے جذبات عشق سے معرّا ہے اور یہ صرف ذہنی مشق کا نتیجہ ہیں۔

مرزا کی غزلوں میں جلوہ گر محبوب، ایک رسمی معشوق بلکہ ناقابلِ ذکر شاہدِ بازاری ہے ؎

بغل میں غیر کی آپ آج سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

شب کو کسی کے خواب میں آیا ہے وہ کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز غیر سے چاہیئے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں!
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ڈاکٹر سید عبداللطیف اس نتیجے پر پہنچے ہیں:-

"اس سے سرسری طور پر غالب کی اس محبت کا تصور ہو سکتا ہے (تاوقتیکہ اس کے خلاف میں کوئی شہادت دستیاب نہ ہو) جو اس کی ذہنی گلگشت اور سچ مچ مادی معاملات میں ظاہر ہوتی رہی۔ اس کی محبت صاف طور پر مادی قسم کی ہے اور اس میں کوئی روحانیت نہیں پائی جاتی، ایسی محبت جو پژمردگی کے عالم میں جاں پروری کرتی اور مکروہاتِ زندگی کو دل سے محو کر دیتی

ہے ، غالب کے مکمل دیوان میں اس کے کوئی
نشان نہیں ملتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ہے کہانی ہمارے
شاعر کی۔ اس نے ایک منتشر زاویۂ نگاہ کے سائے
میں منتشر زندگی بسر کی اور ہمارے لئے ایسی شاعری
چھوڑی جو خود ہم آہنگی سے معرّا ہے۔ اس کا شمار
مشاہیرِ عالم میں نہیں ہو سکتا ۔"

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا زاویۂ نگاہ ایک نئے گوشے
کی نقاب کشائی کرتا ہے ۔ وہ اپنی "تحقیقات" کے آغاز میں سب سے پہلے
اس امر کی تحقیق کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ مرزا غالب کا محبوب
مرد ہے یا عورت ؟ (۷) اس کی صفت کی تعیین میں ہمیں مندرجہ ذیل
اشعار سے مدد مل سکتی ہے ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازار دوست
دود شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یارب!
آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

مرزا نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ ان کا محبوب کوئی سبزہ
رنگ ہے ۔ چونکہ ڈاڑھی مردوں ہی کے ہوتی ہے اس لئے ماننا
پڑے گا کہ وہ مرد ہے اس کے علاوہ بازاروں میں پھرتا ہے بازاروں
ہی میں لوگوں سے پرسش احوال بھی کرتا ہے مردانہ محفلوں میں
شریک ہوتا ہے ۔ نظر بازیاں کرتا ہے شراب پیتا ہے اور بہت پیتا
ہے ۔ ان تمام باتوں سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ مرد ہی ہے کیونکہ
مرزا غالب کے زمانے میں یہ سب باتیں عورتوں کے لئے ممنوع
اور ناممکن تھیں ۔ البتہ بازاری عورتیں اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ۔ اگر
یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ سب اشعار ایک ہی محبوب کی شان میں
نہیں کہے گئے ہیں بلکہ مختلف اشخاص کے متعلق ہیں تو ماننا پڑے
گا کہ مرزا کے بعض محبوب امرد تھے اور بعض طوائفیں اور شاید
یہی قیاس زیادہ صحیح ہے کیونکہ خود مرزا کے قول سے بھی اس کی
تائید ہوتی ہے ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا
اے دریغا وہ رند شاہد باز

مرزا کے محبوب کس طبقے کے لوگ ہوتے تھے ، آئیے اب
ذرا ان کے اخلاق و صفات پر بھی ایک نظر ڈال لیں ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

سن اے غارتگر جنس وفا سن !
شکست قیمت دل کی صدا کیا

تو وہ بدخو کہ تحیر کو تماشا جانے
غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بت عربدہ جو کی

گالی گلوچ ، تُو تڑاق اس کا شیوہ ہے ۔ بیوفا اور ستمگر ہے ،
بے سبب آزار رہتا ہے ۔ بے وجہ رنجیدہ ہو جاتا ہے ۔ عاشق سے
دشمنی کرتا ہے ۔ بدخو اور عربدہ جو ہے ۔
مرزا کی زبانی ان کے محبوب کے چند صفات اور بھی

---

(۷) "ایران کی امرد پرستی کا اثر اردو شاعری پر" "تحقیقات" ، ڈاکٹر عندلیب شادانی ، ص ۱۹۳

سُن لیجئے ؎

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا کہ دیکھئے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو یہ خو کہیں
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

[در پردہ اسے غیروں سے تعلق ہے۔ غیر کی محفل میں بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ غیر کو بوسہ بھی دیتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو بھی غیر کے ساتھ رہتا ہے دگر مرزا بیچارے کو بوسہ نہیں دیتا، اور دل چھین لینے کی فکر میں ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ کبھی بغیر مانگے ہی بوسہ دے دیتا ہے۔ کبھی مرزا کے یہاں آبھی جاتا ہے اگرچہ دیر سے پہنچتا ہے کیونکہ کوئی سدِ راہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی رات کو مرزا کے یہاں بھی رہ جاتا ہے اگرچہ مرزا کو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے کہ کہیں رقیب روسیاہ نہ آجائے اور سارا بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔]

مرزا کے ساتھ اس ہرجائی معشوق نے جو سلوک کئے وہ بھی سننے کے قابل ہیں۔

ع

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن اربابِ وفا ہو جانا

مرزا نے معاملہ بندی کے جو نمونے پیش کئے ہیں وہ درج ہیں، قارئین خود فیصلہ کر لیں کہ یہ خیالات کس پایہ کے ہیں اور ان کے مصنف کو عشقیہ شاعری کی دنیا میں کون سا درجہ ملنا چاہیئے ؎

دھول دھپّا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن سے پاؤں

اسد اللہ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

ڈاکٹر عندلیب شادانی اس بحث کا اختتام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مرزا کی عشقیہ شاعری کے جو نمونے ہم نے پیش کئے ہیں انہیں انصاف کی نظر سے دیکھنے کے بعد غالباً ہر شخص ہماری رائے سے اتفاق کرے گا کہ اس قسم کا کلام خواہ وہ مرزا کا ہو یا کسی دوسرے شاعر کا اردو زبان کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ جن واقعات و حالات کا ان میں ذکر ہے انہیں دنیائے محبت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ البتہ بد ذوقی، بے حسی، بے غیرتی اور

ناپختگی کا مظاہرہ اچھی طرح کیا گیا ہے ۔ کیا انہیں اشعار کے مصنف کو ہمیں اپنی زبان کی عشقیہ شاعری کا بہترین استاد تسلیم کر لینا چاہیئے اور کیا عرق خجالت میں غرق ہوئے بغیر ہم اس قسم کے اشعار اُردو کی عشقیہ شاعری کے نمونہ کی حیثیت سے دُنیا کے سامنے پیش کر سکتے ہیں ؟ .... کیا اچھا ہوتا کہ یا تو مرزا غالب عشقیہ شاعری کو ہاتھ ہی نہ لگاتے یا پھر جب اس مضمون کو چھیڑا تھا تو نقالی سے گریز کرتے اور صرف ان واقعات کو اپنے اشعار کا موضوع بناتے جو انہیں اپنی "حیات معاشقہ" میں پیش آئے تھے بشرطیکہ انہیں صحیح معنی میں کبھی عشق و عاشقی سے سروکار رہا ہو کیونکہ امرد پرستی کو عشق و محبت کے نام سے پکارنا اس شریف جذبہ کی انتہائی توہین کرنا ہے ۔ کیا اچھا ہو کہ اُردو کے حامی اس قسم کا کلام جس قدر بھی دستیاب ہو سکے جمع کر کے ایک بار فنا کر دیں ، تاکہ اُردو کا دامن اس مستقل داغ معصیت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو جائے ۔

ہم نے اب تک غالب کی حیات و شاعری کے جنسی پہلو کی بحث کا پس منظر ڈاکٹر شوکت غالب کو بابر کی طرح ، "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا قائل اور پیرو قرار دیتے ہیں ۔ ڈاکٹر اکرام غالب کو "نسوانی حسن" کا رسیا بتاتے ہیں اور "ستم پیشہ ڈومنی" کا ذکر کرتے ہیں ۔ اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کے یہاں لذت چشم و دل کے ساتھ ساتھ لذت "تن" کا بھی بھرپور احساس ہے ۔ اور ڈاکٹر عندلیب شادانی غالب کو امرد پرست قرار دیتے ہیں ۔ ہر محقق کے نظریے میں جنس یا جنسی جبلت قدر مشترک ہے ۔ ڈاکٹر عندلیب نے اپنی "تحقیقات" میں میر تقی میر اور غالب کی امرد پرستی پر بڑی لے دے کی ہے اور امرد پرستی کو اُردو شاعری کے دامن پر ایک بدنما داغ قرار دیا ہے اور اس طرح انھوں نے اپنا سارا غصہ شاعروں پر اُتارا ہے ۔ حالانکہ اگر دامن کسی کا آلودہ ہے تو وہ معاشرے کا ہے ، وہ سماج کا ہے ، وہ اس زندگی اور ماحول کا ہے جس میں شاعر یا ادیب سانس لے رہا ہے بلکہ جی رہا ہے ۔ اگر کسی شاعر نے کسی امرد سے عشق کیا ہے اور اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا ہے تو وہ نہ صرف بے گناہ ہے بلکہ دیانتدار بھی ۔ ڈاکٹر اکرام اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ غالب کے فلسفۂ محبت میں لاکھ عیب سہی لیکن وہ "ترک شیرازی" کی غلامی سے ضرور آزاد تھا ۔ غالب "ترکِ شیرازی" پر مست نہ تھا اور ہوس (PASSION) اور محبت (LOVE) میں وہ بیّن امتیاز کرتا تھا [۸] ۔ لیکن اس کی مستی "شراب طہور" کی وجہ سے بھی نہ تھی ۔ مرزا کے بعض بیانات سے خیال ہو سکتا ہے کہ انہیں عشق میں ایک رند سمجھنا چاہیئے "عاشق صادق" نہیں ۔ انھوں نے ایک اُردو خط میں لکھا ہے :-

> [۹] "ابتدائے شباب میں ایک مرشد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں اور ہم مانع فسق و فجور نہیں ، پیو ، کھاؤ ، مزے اُڑاؤ ، مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی بنو شہد کی مکھی نہ بنو ! سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے ۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے کیسی اشک فشانی ، کہاں کی مرثیہ خوانی ، آزادی کا شکر بجا لاؤ ! غم نہ کھاؤ ! اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی ۔"

---

(۸) ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ، اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
فروغ شعلۂ حسن یک نفس ہے ، ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

(۹) ۔

(۱۰) اگرچہ اخلاقیات نے کبھی "امرد پرستی" پر صاد نہیں کیا، تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے میں اسے کچھ برا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ یہ ایک فیشن کی طرح مروج تھی۔ ہم اس معاشرے کو اگر "خانقاہی معاشرہ" کہیں تو کچھ بے جا نہ ہوگا کیونکہ اخلاقی اور روحانی قدریں جو معاشرے میں مستعمل تھیں سب خانقاہوں سے ماخوذ تھیں۔ خانقاہ عوام کا ایک ایسا ادارہ تھا جہاں عوام بلا امتیاز مذہب و ملت جمع ہو سکتے تھے۔ صوفیائے کرام کے اقوال پر سر دھنتے تھے، جہاں "دُنیا ہیچ و ہمہ کار دنیا ہیچ" کے ساتھ ساتھ تلقین عشق کی جاتی تھی جس (حسنِ مطلق) کے چرچے رہتے تھے۔ عوام بقدر ہمت "حسن و عشق" کا مفہوم سمجھنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ غرض جنسی جبلت کا دبا ہوا طوفان ایک تو ارتفاعی عمل کے ذریعے محبوب حقیقی تک پہنچا (اس عمل میں بیشتر صوفیائے کرام نے ہی حصہ لیا) تو دوسری طرف یہ جنسی جنون کی صورت اختیار کر بیٹھا۔ جنسی بے راہ روی نے امرد بازی کا روپ دھار لیا۔ شبلی نعمانی نے "شعر العجم" میں اس بدعت کا ذکر کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ امرد پرستی فارس سے ہندوستان آئی۔ وہاں پردے کی سختی کی وجہ سے امرد کو زنانہ لباس پہنا کر ساقی بنایا جاتا تھا اور بعد میں نشے کی حالت میں وہی ساقی جنسی آسودگی کا ذریعہ بن جاتا تھا۔ لیکن اس کا آغاز یونان قدیم سے ہوا، وہاں کے دیوتا بھی امرد پرست معلوم ہوتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اہلِ یونان کے نزدیک حسن کا آئیڈیل "مرد" تھا، عورت نہیں۔ ہندوستان میں اس کے برعکس حسن کا آئیڈیل "عورت" ہی تھی یہی وجہ ہے کہ قدیم ہندوستانی لٹریچر میں کہیں امرد پرستی کا ذکر نہیں ملتا۔ یونان سے ایران ہوکر فارسی شاعری کے ذریعے یہ بدعت اُردو شاعری تک پہنچی۔ محبوب کے لئے صیغۂ مذکر استعمال کرنا غزل کی تہذیب میں داخل ہو گیا۔

(۱۱) عشق اور عشقیہ شاعری دونوں سماج اور سماجی کلچر یا سماجی معیاروں اور روائتوں کی پیداوار ہیں۔ ہمارے جسم، ہماری روحیں جیسے رس میں پکائی جائیں گی جیسا قوام ہمارے جذبات و احساسات کے لئے ہمارا کلچر صدیوں میں تیار کرتا ہے ویسا ہی ہمارا عشق ہوتا ہے اور ویسی ہی ہوتی ہے ہماری عشقیہ شاعری۔ ہم اپنی آنکھوں سے معشوق کو نہیں دیکھتے، اپنے حواس لمسیہ سے اس کے جسم کی نرمی و گداز کا احساس نہیں کرتے، اپنے کانوں سے اس کی آواز نہیں سنتے، اپنے مشام سے اس کے بالوں کی خوشبو نہیں سونگھتے بلکہ جس کلچر کو ہم قبول کر لیتے ہیں اس کلچر کی آنکھوں، ہاتھوں، کانوں اور ناک سے یہ سب کرتے ہیں۔ ہماری انفرادیت خود اس کلچر کی پیداوار ہے۔ ہر کلچر احساس کائنات (جس میں احساس حسن شامل ہے) کے لئے خفیہ حواس و خفیہ زبان پیدا کر لیتا ہے۔ سماج جنسیات کی پیداوار ہے اور جنسیات سماج کی، اسی آب و ہوا میں ہماری انفرادیت، محبت اور شاعری میں اپنے خال و خط اُجاگر کرتی ہے۔

(۱۲) غزل میں ہمارے شعور کا ارتکاز، نفس جنسیت اور نفس محبت پر شدت سے ہوتا ہے۔ ہم اس وقت عاشق محض ہوتے ہیں نہ کہ کسی مرد یا عورت کے عاشق اور ہمارا محبوب، محبوب محض ہوتا ہے نہ کہ مرد یا عورت، ہم غزل لکھتے وقت تفصیلات کے رپورٹر نہیں ہوتے بلکہ حسن و محبت کے داخلی قدروں کے نقاد اور پارکھی ہوتے ہیں۔ اسی ارتکاز کی بدولت غزل میں وہ عالمگیر صفات اور آفاقیت (UNVERSALITY) وہ عام اپیل اور وہ دور رسی آتی ہے۔ اسی سے غزل میں وہ زندگی آجاتی ہے

---

(۱۰) "جنسی جبلت اور اُردو شاعری" (جاوید وششٹ) "جوار بھاٹا" مئی ۱۹۶۴ء

(۱۱) "اُردو کی عشقیہ شاعری" فراق ص۱۴۴

(۱۲) اُردو کی عشقیہ شاعری ص۴۹

جو ہماری اور اصنافِ سخن میں اس حد تک مشکل سے آپاتی ہے۔ غزل میں ہم روحِ محبت اور روحِ حسن سے دوچار ہوتے ہیں اور عشقِ مجازی یا جنسیت کی معراجی منزلوں سے گزرتے ہیں۔ اردو غزل میں لطافت، نزاکت اور سلیقے سے مذکر فعل لانا بدچلنی نہیں ہے، خلافِ فطرت عمل نہیں ہے بلکہ بہت شریف جذبہ ہے۔ اردو غزل میں معشوق کے لئے کھلے ڈلے طور پر مونث فعل لانے سے جذبۂ عشق اور جمالِ محبوب کی اہمیت اور لطافت کو ٹھیس لگے گی۔

(۱۲) ڈاکٹر عندلیب شادانی کا نقطۂ نظر سائنٹفک نہیں بلکہ اخلاقی و مذہبی ہے اور بے حد جذباتی۔ ممکن ہے غالب اپنے "چمپئی رنگت" کے عہد میں "امرد" کی طرف مائل ہوئے ہوں۔ لیکن ان کی شاعری کا قرینہ ان تمام اشعار کے باوجود جو ڈاکٹر عندلیب نے ثبوت کے طور پر پیش کئے ہیں، بقول ڈاکٹر اکرام "نسوانی حسن" کے ہی دلدادہ تھے۔ ڈاکٹر شادانی نے فارسی شعرا دقیقی، سلطان سنجر سلجوقی، خاقانی، انوری، ظہیر فاریابی، سعدی، حافظ، امیر خسرو، سرمد، غنیمت اور سحابی وغیرہ کے یہاں بھی امرد پرستی کے رجحانات کی نشان دہی کی ہے۔ لیکن جب حافظ کا ذکر کر چکے تو انھوں نے فوراً پلٹا کھایا اور اپنی صفائی ان الفاظ میں پیش کی:۔

"میرا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ خواجہ حافظ واقعی امرد پرست تھے۔ لیکن ان کے اشعار سے کم از کم اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ ان کے عہد میں امرد پرستی نہ صرف یہ کہ معیوب نہ سمجھی جاتی تھی بلکہ فیشن میں داخل تھی اور ہر شاعر اپنے اشعار میں سوسائٹی کے مذاق اور ملکی رواج کے مطابق کسی نوخط یا سادہ رُو سے عشق کا اظہار ضرور کرتا تھا۔"

یہی بات وہ غالب کے بارے میں کہہ سکتے تھے (غالباً انہیں حافظ سے کچھ عقیدت تھی اسی لئے انہیں اپنی صفائی دینی پڑی اور غالب کو وہ رگڑنا چاہتے تھے اس لئے رگڑ دیا)

غالب کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ اگر غالب کی ازدواجی زندگی خوش گوار ہوتی تو غالب کی زندگی میں جنسی بے راہ روی پیدا نہ ہوتی۔ وہ کبھی "ستم پیشہ ڈومنی" کی طرف رجوع نہ کرتے۔ لیکن حالی نے ازراہِ عقیدت اس حقیقت پر مرزا کی ظرافت کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا کے خانگی تعلقات پر حالی رقم طراز ہیں کہ[14] "مرزا کی بی بی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں۔ وہ نہایت متقی پرہیزگار اور نماز روزے کی سخت پابند تھیں۔ جس قدر مرزا مذہبی معاملات میں بے مبالات تھے اسی قدر ان کی بی بی احکام مذہبی کی پابند تھیں۔ یہاں تک کہ بی بی کے کھانے پینے کے باسن الگ اور شوہر کے الگ رہتے تھے۔ بایں ہمہ بی بی شوہر کی خدمت گذاری اور خبر گیری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی تھیں۔ مرزا صاحب ہمیشہ مردانے مکان میں رہتے تھے مگر ان کے کھانے پینے و ٹھنڈائی وغیرہ کا انتظام سب گھر میں ہوتا تھا۔ مرزا میں جب تک چلنے پھرنے کی طاقت رہی ہمیشہ وقت معین پر ایک بار وہ

---

(۱۳) "اہل دہلی میں سے جن لوگوں نے مرزا کو جوانی میں دیکھا تھا اُن سے سنا گیا ہے کہ عنفوانِ شباب میں وہ شہر کے نہایت حسین اور خوبرو لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور بڑھاپے میں بھی جبکہ راقم نے پہلے ہی بار ان کو دیکھا ہے ...... خوبصورتی کے آثار ان کے چہرے اور قد و قامت اور ڈیل ڈول سے نمایاں طور پر نظر آتے تھے۔ مگر اخیر عمر میں قلت خوراک اور امراض دائمی کے سبب وہ نہایت نحیف و نزار ہو گئے تھے لیکن چونکہ ہاڑ بہت چکلا، قد کشیدہ اور ہاتھ پاؤں زبردست تھے اس حالت میں بھی وہ ایک نو وارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔" "یادگارِ غالب" ص۱۶۔۱۷

(۱۴) "یادگارِ غالب" ص۹۲۔۹۳

گھر میں ضرور جاتے تھے۔ مگر چونکہ شوخی اور ظرافت ان کی گھٹی میں پڑی تھی ان کی زبان قلم سے بی بی کی نسبت اکثر ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن کو ناواقف آدمی نفرت یا بے تعلقی پر محمول کر سکتا ہے۔

حالی نے بڑی خوبصورتی سے حقائق پر لطائف و ظرائف کے پردے ڈال دیئے ہیں تین لطیفے ملاحظہ کیجئے:۔(۱) لطیفہ۔ کسی نے امراؤ سنگھ نام ایک شاگرد کی دوسری بی بی کے مرنے کا حال مرزا کو لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ ------ کہ اس کے ننھے ننھے بچے ہیں اور اب اگر تیسری شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ اور بچوں کی کس طرح پرورش ہو؟ مرزا اس کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

"امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ، ایک وہ ہیں کہ دو دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے۔"

۲۔ لطیفہ ــــ جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرا سامنے رکھا۔ طوطا سردی کے سبب پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا مرزا نے دیکھ کر کہا:۔ "میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو، نہ بچے، تم کس فکر میں یوں سر جھکائے بیٹھے ہو؟"

۳۔ لطیفہ ــــ ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے۔ ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا۔ مگر محلسرا خود نہ دیکھ سکے، گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لئے بی بی کو بھیجا۔ وہ دیکھ کر آئیں تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا۔ انھوں نے کہا کہ اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں۔ مرزا نے کہا "کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟" (۱۵)

رباعی

اے آنکہ براہ کعبہ روئے داری!
دانم کہ گزیدہ آرزوئے داری
زیں گونہ کہ تند می خرامی، دانم
در خانہ زنے ستیزہ خوئے داری

نفسیاتی اعتبار سے یہ لطیفے کافی اہم ہیں۔ مرزا نے، مرزا علاء الدین احمد خاں علائی کو جون ۱۸۶۱ء میں لکھا تھا:۔

"ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ عالم ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں، چنانچہ میں آٹھویں رجب سنہ ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا، ۷ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔" (۱۶)

۸ر اگست ۱۸۶۱ء کو میر مہدی حسین مجروح کو مرزا نے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"وہ باتیں کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے زیادہ؟ ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چونسٹھ برس کی

---

(۱۵) یادگار غالب۔ ص ۹۳-۹۴

(۱۶) خطوط غالب مرتبہ مالک رام ص ۳۷ (خط ۹)

عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ
ہاں، رہا آئی تھی۔ تفت بریں دبا۔" (۱۷)

اب ایک جملہ منشی ہرگوپال تفتہ کے خط کا اور ملاحظہ کیجئے۔ مرزا
لکھتے ہیں :۔

"جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا
اختیار کرتی ہے، میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ
ہے۔" (۱۸)

فرائڈ کی تعلیمات کا اصل اصول یہ ہے کہ شعوری کردار کا
تعین لاشعوری محرکات واسباب کے زیر اثر ہوتا ہے[۱۹] مذکورہ بالا
مثالوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو "پھانسی کا پھندا"، "سرنگوں طوطا"
"بلا"، "زن ستیزہ خو"، "بیڑی اور زندان"، "تفت بریں دبا"
"اچھی جورو"، "برا خاوند" وغیرہ الفاظ مرزا کے ذہن کے
لاشعوری گوشوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ اور حقیقت ظرافت
کے پردوں سے جھانکتی ہوئی صاف نظر آتی ہے کہ مرزا اپنی ازدواجی
زندگی سے مطمئن نہیں تھے۔ مرزا کی ظرافت جہاں ایک طرف ان
کی غیر معمولی ذہانت کی غمازی کرتی ہے تو دوسری طرف اُن "بنی
سمجھوتے" کی عکاس بھی ہے جو مرزا نے غیر مطمئن اور ناخوش گوار
حالات سے کر لیا تھا۔ آخر یہ سمجھوتہ مرزا کی وضعداری میں شامل
ہو گیا لیکن اس کا ردعمل یہ ہوا کہ مرزا نے پینی شروع کر دی، حالی
لکھتے ہیں کہ (۲۰) مرزا کو مدت سے رات کو سوتے وقت کسی قدر
پینے کی عادت تھی، جو مقدار انھوں نے مقرر کر لی تھی اس سے زیادہ
کبھی نہیں پیتے تھے جس بکس میں بوتلیں رہتی تھیں اس کی کنجی داروغہ
کے پاس رہتی تھی اور اس کو سخت تاکید تھی کہ اگر رات کو سرخوشی
کے عالم میں مجھ کو زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو ہرگز میرا کہنا نہ ماننا
اور کبھی مجھ کو نہ دینا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ رات کو کنجی طلب کرتے تھے
اور نشے کی جھانجھ میں داروغہ کو بہت برا بھلا کہتے تھے، مگر داروغہ
نہایت خیر خواہ تھا ہرگز کنجی نہ دیتا تھا۔ اول تو وہ مقدار میں بہت
کم پیتے تھے، دوسرے اس میں تین حصے گلاب ملا لیتے تھے جس سے
اس کی حدت اور تیزی کم ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مرزا میر مہدی مجروح کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"جاڑا پڑ رہا ہے۔ ہمارے پاس شراب آج
کی اور ہے، کل رات سے نری انگیٹھی پہ گزارا
ہے، بوتل، گلاس موقوف۔" (۲۱)

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں :۔

"آج میرے پاس "۴" نقد بکس میں اور چار بوتل
شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں
موجود ہیں۔" (۱ جون ۱۸۵۳ء)

"مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں

---

(۱۷) خطوط غالب مرتبہ مالک رام ص۳۲۵ (خط ۳۷)
(۱۸) " " " " ص۹۰ (خط ۱۰۵)
(۱۹) "جنس کا جنسیاتی پہلو" مصنفہ کینتھ واکر اور پیٹر فلیچر مترجم سید قاسم محمود، ص۲۸
(۲۰) یادگار غالب ص۶۷
(۲۱) خطوط غالب، مالک رام ص۳۳۳ (خط ۴۴)
(۲۲) " " " ص۲۴ (خط ۱۷)

تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیسے جاتا ہوں، باتیں کئے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیئے جاتا ہوں، جب موت آئے گی مر جاؤں گا، نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بسبیل حکایت ہے۔" (۱۹ نومبر ۱۸۵۸ء) (۲۳)

"۱۵ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی۔ اب صرف روٹی ملے جاتی ہے شراب نہیں۔" (نومبر ۱۸۵۹ء) (۲۴)

"بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابر و باراں میں پیش از طعام چاشت یا قریب شام تین گلاس پی لیتا تھا۔ اور شراب شبانہ معمولی میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس میں برس میں بیس برسایتیں ہوئیں، بڑے بڑے مینہ برسے پینا ایک طرف، دل میں بھی خیال نہ گزرا، بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے۔" (۲۵)

مرزا کی جوانی شراب پی کر بہک گئی "تماش بینی" اور "جوا" کا بھی چسکا لگ گیا۔ آخر اس بے راہ روی کی بدولت مرزا کو جیل کی ہوا بھی کھانی پڑی۔ حالی نے اس واقعہ کو ذرا ہلکا کر کے لکھا ہے :-

"مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ اس چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا...... یہ واقعہ مرزا صاحب پر بہت شاق گزرا تھا۔ اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جو اُن کو قید خانے میں گزرے ان کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی۔" (۲۶)

منشی ہرگوپال تفتہ کو ایک خط میں مرزا لکھتے ہیں :-

"انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق ؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے! جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اس کو زیست کیونکر نہ دشوار ہو۔ ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔" (۲۷)

اس "کچھ معشوق" میں کہیں بقول ڈاکٹر عندلیب شادانی کے، "کچھ امرد اور کچھ کسبیاں" تو شامل نہیں ؛

ازدواجی زندگی کی ناکامی کے بعد شراب اور جوئے کے شغل سے فرصت ملی تو نوجوان مرزا نوشہ کسبیوں کے کوٹھے کے ہو رہے۔ اور وہاں سے کوئی نامراد مرض بھی لے آئے، یہ نامراد مرض ہی اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ مرزا طوائف کے کوٹھے پر

(۲۳) خطوط غالب، مالک رام صـ ۶۱ (خط ۶۰)
(۲۴) " " صـ ۶۹ (خط ۷۳)
(۲۵) " " صـ ۸۸ (خط ۱۰۱)
(۲۶) یادگارِ غالب حالی صـ ۲۷-۲۸
(۲۷) خطوط غالب مالک رام صـ ۴۲-۴۳ (خط ۴۰)

داد عیش دیتے رہے۔ اس موضوع پر مزید تحقیقات کا کام تو ہمارے اطبا کو کرنا چاہئیے بہر حال حالی نے بھی مرزا کے "دائمی امراض" کا ذکر کیا ہے۔

"مرزا صاحب کے اولاد کچھ نہ تھی۔ ابتدا میں سات بچے پے در پے ہوئے مگر کوئی زندہ نہیں رہا۔"(۲۸)

ساتوں بچوں کا مر جانا معنی خیز ہے (مرزا کرٹھے کے کسی ایسے روگ میں تو مبتلا نہیں تھے جس کے اثر سے بچے مر گئے ہوں)

غالب کے خطوں سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں جو قابلِ غور ہیں:-

بنام مرزا تفتہ ——— "بیمار ہوں، ہات پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھئے انجام کار کیا ہوتا ہے۔"(۲۹) (۱۸۶۳ء)

بنام مرزا تفتہ ——— "پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا ہے مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا، کھولن شروع ہو گئی، حکما جو دو تین یہاں ہیں ان کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بھرتا بندھے گا وہ پکالائے گا جب اس کے پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی، ہلوا زخمی، پنڈلی زخمی۔"(۳۰)

" ——— "جملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بہ مرگ ہوں دونوں ہاتھوں میں پھوڑے، پاؤں میں ورم: نہ وہ اچھے ہوتے ہیں، نہ یہ رفع ہو ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا، لیٹے لیٹے لکھتا ہوں"

بنام مرزا تفتہ ——— میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم اور ہاتھ کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔" (۳۲)

بنام منشی نبی بخش حقیر ——— "ایک مدت سے میرا پاؤں چھل رہا تھا چھوٹے چھوٹے دانے بطریق دائرہ کف پا کے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر جائے ایک دانہ ان دونوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہو گیا اور وہ قریب ٹخنے کی ہڈی کے تھا۔" (۱۸۵۰ء) (۳۳)

" ——— "مجھ کو بھی بسبب فصل بہار کے ہیجان ہے۔ احتراق کے شدائد بہ نسبت اور دنوں کے زیادہ ہیں۔ لازم یوں تھا کہ شاہترہ پیتا اور مسہل لیتا مگر کچھ نہیں لے سکا صرف فصد باسلیق پر قناعت کی اور آدھ سیر خون لے لیا۔" (مارچ ۱۸۵۱ء) (۳۴)

---

(۲۸) یادگار غالب حالی ص ۳۳

(۲۹) خطوط غالب، مالک رام ص ۸۵ (خط ۹۹)

(۳۰) " " " ص ۸۸ (خط ۱۰۱)

(۳۱) " " " ص ۸۹ (خط ۱۰۳)

(۳۲) " " " ص ۸۹ (خط ۱۰۴)

(۳۳) " " " ص ۱۰۳ (خط ۲)

(۳۴) " " " ص ۱۰۶ (خط ۷)

بنام منشی نبی بخش حقیر ـــــ "میرے پاؤں میں دو ایک پھوڑے
نکلے ہیں ۔" (۳۵)

" ـــــ "آگے ایک قولنج کا دورہ تھا، اب وجع المفاصل
کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ جب یہ درد اٹھ
کھڑا ہوتا ہے، چار پہر، چھ پہر، دو پہر رہتا
ہے، پھر رفع ہو جاتا ہے" (۹ مارچ ۱۸۵۲ء) (۳۶)

بنام قاضی عبدالجمیل جنون ـــــ "اب میں تندرست ہوں۔ پھوڑا پھنسی
زخم جراحت کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ
شدت ہے کہ خدا کی پناہ۔ ضعف کیوں نہ
ہو؟ برس دن صاحب فراش رہا ہوں ستر برس
کی عمر، جتنا خون بدن میں تھا۔ بے مبالغہ آدھا
اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا ۔" (نومبر ۱۸۶۱ء) (۳۷)

بنام نواب انورالدولہ شفق ـــــ "سال گذشتہ مجھ پر سخت گزرا۔ ۱۲، ۱۳
مہینے صاحب فراش رہا، اٹھنا دشوار تھا،
چلنا پھرنا کیسا؟ نہ تپ، نہ کھانسی، نہ اسہال
نہ فالج، نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک
صورت پڑ گئی کہ رد یعنی احتراق کا مرض
مختصر یہ کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے
ہر پھوڑا ایک زخم، ہر زخم ایک غار، ہر روز
بے مبالغہ بارہ تیرہ پھاہے اور پاؤ بھر مرہم
درکار ۔" (۱۵ فروری سنہ ۱۹۶۴ء) (۳۸)

بنام غلام حسنین قدر بلگرامی ـــــ "میں برس دن سے بیمار تھا۔ ایک
پھوڑا اچھا ہوا، دوسرا پیدا ہوا۔ اب فی الحال
دونوں پاؤں ہاتھوں میں نو پھوڑے ہیں،
دونوں پاؤں پر دو پھوڑے پنڈلی کی ہڈی
پر ایسے ہیں کہ جن کا عمق ہڈی تک ہے ۔"
(۱۲ اگست سنہ ۱۹۶۳ء) (۳۹)

" ـــــ "میں اب اچھا ہوں۔ برس دن صاحب فراش
رہا ہوں۔ چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم
خونچکاں، ایک درجن پھاہے لگ جاتے تھے،
جسم میں جتنا لہو تھا پیپ ہو کر نکل گیا۔
(۲۲ نومبر سنہ ۱۹۶۴ء) (۴۰)

بنام شیو نرائن آرام ـــــ "اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اس
دائیں ہاتھ کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں
ہاتھ میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے۔ حاجتی میں
پیشاب کرتا ہوں، اٹھنا دشوار ہے" (۱۳ مئی ۱۸۶۴ء) (۴۱)

---

(۳۵) خطوط غالب، مالک رام ص ۱۱۳ (خط ۱۳)
(۳۶) " " " ص ۱۱۵ (خط ۱۴)
(۳۷) " " " ص ۱۸۷ (خط ۱۷)
(۳۸) " " " ص ۲۱۴ (خط ۲۱)
(۳۹) " " " ص ۲۷۰، ۲۷۱ (خط ۱۸)
(۴۰) " " " ص ۲۷۱ (خط ۱۹)
(۴۱) " " " ص ۴۴۷ (خط ۳۵)

یہ غار سے زخم، ورم، گھولن، پھوڑے، دانے بطریق دائرہ، اغراق،
وجع الصدر کا دورہ، پیپ، زخم، وغیرہ "کوڑھ کے رنگ" کی علامتیں
تو نہیں ہیں ؟

تخم تاثیر صحبت کا اثر —— مرزا کسبیوں اور جواریوں کی صحبت
میں رہ کر اچھے خاصے بگڑ گئے تھے اس کا ثبوت ان کے وہ کلمات ہیں جو
تہذیب سے گرے ہوئے ہیں مگر مرزا بے تکلفانہ اپنے خطوں میں
استعمال کرتے ہیں۔ کم از کم مرزا کے شایانِ شان نہیں، مثلاً منشی ہرگوپال
تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادی
فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے
کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں جیسا وہ گھاگس اُلّو عبدالواسع
ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلّو کا
پٹھا قتیل ...... کو غلط کہتا ہے" (اگست ۱۸۶۰ء) (۴۲)

بنام سید یوسف مرزا —" انیسویں اپریل کی صبح کو بھائی فضلو
جن کو میر کاظم علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے احتلام الدولہ
کا خطاب دیا ہے ......" (۱۸۶۰ء) (۴۳)

"اُلّو کا پٹھا" اور "احتلام الدولہ" "پسر نوح"، کی صحبت کی
غمازی کرتے ہیں۔

اگر بغور اس پہلو پر توجہ دی جائے تو مرزا کی "قدر ناشناسی"
کا راز کھل جائے۔ غالب مشکل پسندی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے لاابالی
پن کی وجہ سے بحیثیت انسان کچھ اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے
تھے۔ حالی کا یہ بیان ہماری بات کی تصدیق کرتا ہے :۔

"جب یہ مقدمہ داخل دفتر ہو گیا۔ ایک مدت
کے بعد لوگوں نے مرزا کے نام گمنام خط ......
بھیجنے شروع کئے۔ جن میں شراب نوشی اور بدمذہبی
وغیرہ پر سخت نفریں اور طعن و ملامت لکھی ہوتی تھی۔
ان دنوں مرزا کی عجیب حالت تھی۔ نہایت مکدر
اور بے لطف رہتے تھے۔" (۴۴)

"...... اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی،
مسکرا کر کہنے لگے کہ اس اُلّو کو گالی دینی بھی نہیں آتی،
بڈھے اور ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو
غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں۔ کیونکہ اس
کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی
دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا،
یہ قرمساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے
اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا" (۴۵)

آخر آخر غالب کو بھی اس کا احساس ہو چلا تھا کہ وہ بے دین اور
گمراہ ہو گیا۔ واقعی وہ گنہگار ہے۔ مثلاً قاضی عبدالجمیل جنون کو ایک
خط میں لکھتے ہیں :۔

---

(۴۲) خطوطِ غالب مالک رام ص ۲۱۴ (خط ۲۱)
(۴۳) خطوط " " ص ۲۲۸ (خط ۱)
(۴۴) یادگار غالب ص ۴۸-۴۹
(۴۵) " ص ۵۱

"ایک کم ستر برس دنیا میں رہا، کوئی کام دین کا نہ کیا۔ افسوس ہزار افسوس"۔ (جون ۱۸۶۴ء) (۴۶)

یا یہ شعر ملاحظہ کیجئے ؎

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

فرائڈ کا "جبلت جنس" کو "محور حیات" قرار دینا مبالغہ آمیز سہی، تاہم اس نے کچھ باتیں بڑی پتے کی بتائی ہیں۔ مثلاً آرٹ کو جبلت جنس کا ارتفاعی عمل (SUBLIMATION) قرار دیتا ہے "جب ہم جنسی جبلت کو دباتے ہیں تو یہ دوسرا راستہ فنونِ لطیفہ کا ہوتا ہے" گویا جبلت جنس کا ارتفاع (SUBLIMATION) آرٹ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس نفسیاتی حقیقت کے انکشاف نے ادب کے بہت سے تاریک گوشوں کو روشن کر دیا۔ فرائڈ نے ارتفاعی عمل کے سلسلے میں ایک نیا انکشاف یہ بھی کیا ہے کہ ہماری جملہ جنسی خواہشیں اعلیٰ و ارفع نہیں ہو پاتیں بلکہ ان کا ایک جزو ہی ارتفاع پذیر ہوتا ہے ــ (۴۷)

اگر ہم کسی ایسی خواہش کو جس سے جذبے کی کوئی شدید شکل مربوط ہو، دبا لیں تو وہ ہمارے ذہن میں ہمیشہ اصلی حالت میں موجود رہتی ہے اور کسی نہ کسی طریق سے ہماری روزمرہ زندگی پر برابر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔ (۴۸) مرزا کو "ستم پیشہ ڈومنی" کی یاد بڑھاپے میں بھی برابر آتی رہی ــ،

مرزا نے بے شمار خطائیں اور خامیوں کے باوصف، اُردو غزل کو فکر کی گہرائیاں اور تخیل کی بلندیاں عطا کی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے۔ غالب ریاکار نہیں تھے، انھوں نے اپنے باطن کو کھول کر رکھ دیا تھا ؎

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

مگر بیچارے مرزا کے ساتھ نقادوں نے بھی بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ کسی نے انہیں فلسفی بنا دیا تو کسی نے صوفی یا پھر انہیں اخلاقی اور مذہبی عینکوں سے دیکھا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مرزا کی شاعری میں ارتفاعی عمل بھی برابر ارتقا پذیر نظر آئے گا۔ غالب نے اُردو غزل کو رفعت و عظمت بخشی ہے۔ ایک ناآسودہ، تشنہ کام فن کار کی طرح مرزا نے شعر کے فن کو وہ جلا دی کہ آج وہ اس کی بدولت صحیح معنوں میں "غالب صدی" کا ہیرو ہے۔

ع

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے

●

---

(۴۶) خطوط غالب مالک رام صفحہ ۱۹۰ (خط ۲۳۴)
(۴۷) "جنسی جبلت اور اُردو شاعری" رجا آغا سید وشمست "جوار بھاٹا" مئی ۱۹۶۴ء

تنویر احمد علوی

تصویر کا دوسرا رُخ

غالب کی وفات پر ایک صدی بیت رہی ہے۔ ان کے کلام و کمال کے بارہ میں ان کے معاصرین نے جو کچھ کہا تھا اس پر پچھلے سو برس میں کیفیت و کمیت کے اعتبار سے غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے۔ ان کے سوانح و سیرت سے متعلق بہت سی جزئیات اور تفصیلات کا احاطہ کیا جا چکا ہے اور ان کے شعور و شعر کی متنوع حیثیتوں کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش مختلف سطحوں پر کی جا چکی ہے۔

حالی کے بعد، جو ان کی عظمت کے پہلے نقیب تھے ان پر تنقید کرنے والوں میں اگر ایک طرف ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں جیسے ناقدین شامل ہیں تو ان پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، مولانا امتیاز علی عرشی اور مالک رام جیسے محققین کے نام آتے ہیں، ان کے ذہن اور زندگی پر اصولی گفتگو کا محرک اگر ڈاکٹر عبداللطیف جیسا کوئی صاحبِ علم مفکر ہے تو ان کے شعور و شخصیت کی تہذیبی قدر کے تعین کی کوشش رشید احمد صدیقی جیسے کسی صاحبِ نظر ادیب کی طرف سے عمل میں آتی ہے۔

ان حضرات کے علاوہ ان پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں میں بہت سے محقق، نقّاد، عالم اور ادیب آتے ہیں جن کے نام اور کام نے غالبیات کو آسمانِ ادب کے ایک سلسلۂ کہکشاں کی سی حیثیت دیدی ہے۔

ہمارے اساتذۂ سخن میں سب سے زیادہ شرحیں غالب کے اُردو دیوان کی لکھی گئی ہیں اور ان کے شارحین میں بہت سے استادانِ فن، ماہرینِ ادب اور صاحبانِ درس و تدریس کے علاوہ بعض مزاح نگار تک شریک ہیں۔

اِن کے بارہ میں متعدد رسائل و جرائد کے خاص شمارے نکل چکے ہیں اسی کے ساتھ غالب ان چند گنے چنے ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں میں سے ہیں جن پر انگریزی اور بعض دوسری غیر مُلکی زبانوں میں بھی قابلِ ذکر کام ہوا ہے،

اُردو شعراء میں وہ تنہا خوش قسمت شاعر ہیں جن کے دیوان کے "مرقعِ چغتائی" اور نسخۂ عرشی جیسے مایۂ ناز اور مستند ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔

غرض کہ مجموعی حیثیت سے جہاں تک اُردو زبان و ادب کا تعلق ہے پچھلے سو برس کو ایک خاص معنی میں ہم غالب کی صدی کہہ سکتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ان کے شعر و شعور میں مستقبل کے لئے جو امکانات چھپے ہوئے تھے ان کو اُجاگر کرنے میں ہمارے بہترین افراد و اشخاص نے حصّہ لیا ہے او جو کمی رہ گئی ہے وہ اب غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر پوری ہو جائے گی جس کے سلسلہ میں ہندوستان اور پاکستان کے ماسوا دُنیا کے متعدد دوسرے ملکوں کی دانش گاہوں

اَدبی انجمنوں اور تہذیبی اداروں سے تعلق رکھنے والے دانشور، اہلِ قلم اور فن کار حصّہ لے رہے ہیں۔

غالب نے جس وقت اپنے بارہ میں شاعرانہ تعلّی کے طور پر یہ کہا ہوگا ع

شہرت شدم بگیتی بعد من خواہد شدن

تو مبالغہ کی سطح پر بھی انہیں یہ یقین نہ ہوگا کہ ان کی موت کے بعد واقعی وہ وقت آنے والا ہے جب اُن کی شاعرانہ شہرت اور ادبی منزلت کو "فلک الافلاک" تک پہنچانے کی کوشش کی جائے گی اور وہ بھی ان کی اس اُردو شاعری کی بدولت جسے وہ زندگی بھر اپنا مجموعہ بے رنگ" سمجھتے اور کہتے رہے یوں بھی شاعری ان کے نزدیک "ذریعہ عزت" نہیں تھی بلکہ وہ "پیشہ سپہ گری" تھا جو سر لپشت سے چلا آتا تھا، یہ دوسری بات ہے کہ اس پیشۂ آبا سے ان کے ہاتھ کچھ نہ لگا تھا سوائے ایک ٹوٹے ہوئے تیر کے جسے انھوں نے اپنا قلم بنالیا تھا۔

شد تیر شکستہ نیاگاں قلمم

بہرحال ان کو جو زندگی میں نہ ملا وہ موت کے بعد مل گیا اور اس طرح ملا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتے تو انہیں شکوۂ کوتاہی داماں ہو جاتا۔

سچ یہ ہے کہ غالب پر پچھلے سو برسوں میں جو کچھ لکھا گیا اس میں چند ناموں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جہاں تک تنقید کا تعلق ہے ہر شخص نے ان کے شعور و شخصیت کے گرد ایک خوبصورت ہالہ کھینچنے اور اس میں "قوس قزح" جیسے رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے۔

اُردو اَدب کو غالب نے جو کچھ دیا ہے اور اس کے بدلے میں اُردو ادب کے ذریعہ جو کچھ ان ملا ہے اس پر شیکسپیر کے ایک انگریز نقاد کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "شیکسپئر کا کچھ حصّہ تو ایسا ہے جس کے لئے ہم اس کے ممنون ہیں اور کچھ حصّہ ایسا ہے جس کے لئے وہ ہمارا ممنون ہے۔"

اس میزان قدر میں جب ایک طرف غالب کے کمال اور دوسری طرف اس کے کمال کے اعتراف کو رکھا جاتا ہے تو اعتراف کا پلّہ کچھ زیادہ بھاری نظر آتا ہے۔

ان کے کلام کا ایک حصّہ یقیناً قابلِ قدر ہے اور اس کے لئے اُردو زبان اور اس کا ادب غالب کا مرہونِ منت ہے لیکن ایک دوسرا حصّہ ایسا بھی ہے اور اس سے کسی طرح صرف نظر ممکن نہیں جس کی بقا کے لئے غالب کو اُردو زبان و ادب کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ اسی کی بدولت نہ صرف یہ کہ وہ زندہ رہا ہے بلکہ درخور اعتنا سمجھا گیا ہے۔ یہ حصہ غالب کے کلام کا معیار اور اس کے کمال کے لئے محک اعتبار نہیں ہے لیکن ہمارے نقاد جس طرح غالب کی تعریف کرتے اور اس کے ایک ایک لفظ کو "گنجینۂ معنی کا طلسم" قرار دیتے رہتے ہیں، اس کو پڑھ کر کبھی قاری کا ذہن اس طرف منتقل ہی نہیں ہوتا کہ غالب کے فکر و فن کے ساتھ بھی کچھ خامیاں وابستہ رہی ہیں جنھیں ان کی خوبیوں سے الگ تو رکھا جاسکتا ہے لیکن ان خامیوں پر ان کی خوبیوں کا پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔

جس طرح کسی انسان کے سوانح و سیرت کے بعض کمزور پہلو بھی اس کی شخصیت کا لازمی جزو ہوتے ہیں اور اس کے انسانی فکر و کردار پر نظر ڈالتے وقت ان کی پردہ پوشی غیر ضروری ہے۔ اسی طرح کسی فن کار کے فن کی خامیاں اور اس کے فکر کی نارسائیاں بھی اس کی فنی شخصیت سے الگ نہیں کی جاسکتیں —— ہمارے محققوں اور ناقدوں نے غالب کی سیرت کے بعض کمزور پہلو تو اجاگر کئے لیکن حالی کے بعد سے اب تک اُردو تنقید کا غالب رجحان یہی رہا ہے کہ نت نئے پہلوؤں سے غالب

کی تعریف کی جائے اور جو چیز دُنیا جہاں کے ادب میں کہیں بھی ملے وہ اپنی تخلیقی تنقید اور انشا پردازانہ چابکدستی کے ساتھ غالب کے کلام میں پیدا کر دی جائے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی تنقید، اس تحسینی اندازِ نگارش کا شاہکار ہے۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوانِ غالب لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں، کون سا نغمہ ہے جو اس سازِ زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں" [۱]

اس صدائے "اناالحق" کی آواز بازگشت اب بھی سننے میں آتی ہے اور غالب پر رومانی تنقید کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

حالی غالب پر تنقید کرنے بیٹھے تو غالب سے عقیدت رکھنے کے باوصف ان کے فکر وفن کے بعض کمزور پہلوؤں کی طرف اشارہ کئے بغیر نہ رہے۔ اگرچہ اس پر وہ ان کے "ابتدائی دورِ شاعری" کا عنوان چسپاں کر دیتے ہیں تاہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مرزا ـــ

"اوّل اوّل ایسے رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چینی ہم عصروں کی خوردہ گیری اور طعن و تعریض سدِ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دُور جا پڑتے، سُنا گیا ہے کہ اہلِ دہلی مشاعروں میں جہاں مرزا ہوتے تھے۔ تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پُر شوکت اور شاندار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے"۔ [۲]

اگرچہ حالی نے مرزا کی اس روش کو ابتدائی دور سے متعلق کیا ہے لیکن خود ان کے اپنے بیان اور اس کی بین السطور سے واضح ہوتا ہے کہ اس روشِ خاص کا سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا، مولوی فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ نواب مصطفٰے خاں شیفتہ جیسے ان کے دوست اور مصاحبین ان کی نوعمری کے دوستوں میں نہیں تھے، دہلی کے مشاعروں میں پیش آنے والی صورت حال کی طرف حالی نے بھی اشارہ کیا ہے اور مولینا محمد حسین آزاد نے بھی ایک موقع پر لکھا ہے کہ ایک مشاعرہ میں مرزا آغا جان عیش نے مرزا غالب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا تھا،

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خُدا سمجھے

اس سلسلہ میں حالی نے یادگار میں مولوی عبدالقادر رامپوری سے متعلق جو لطیفہ تحریر کیا ہے اس کو بھی ذہن میں رکھیے یہ سب واقعات غالب کے صرف ابتدائی دورِ شاعری سے متعلق نہیں ہیں۔

یادگار میں اس دورِ شاعری کے ذہنی پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے مولینا نے لکھا ہے۔

فارسیت کا رنگ ابتدا ہی میں مرزا کی بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا ..... مرزا نے لڑکپن میں مرزا بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اسی روش پر مرزا نے "دو میں چلنا اختیار کیا"۔

خود غالب اپنے ایک شعر میں اس کے دعویدار ہیں کہ طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا قیامت سے کم نہیں، لیکن جس انداز کے شعر اس دور میں مرزا نے کہے ہیں ان میں

---

[۱] نسخہ حمیدیہ ص ۳۳ ، [۲] یادگارِ غالب ص ۱۰۱ ، [۳] آبِ حیات ص ۳۳۶

اس ژرف نگاہی معنی بینی، نکتہ سنجی، دقیقہ شناسی اور اس قدرت کلام کا پتہ نہیں چلتا جو بیدل کی شاعری کی خصوصیت خاص ہے اس کے برعکس وہ ایک ایسا اندازِ مشکل گوئی ہے، جس میں زیادہ سے زیادہ الفاظ کی بازی گری، تراکیب کی بے معنی طلسم بندی اور تخیل کی۔ روح شعبدہ کاری سے کام لیا گیا ہے۔ تصوف جو بیدل کے یہاں "روح شاعری" ہے وہ مرزا کے اس ریختہ میں "شئے نایاب" کا درجہ رکھتی ہے جسے طرز بیدل کا "تمغۂ عنوان" دیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دور شاعری میں مرزا کے یہاں خیال کی باریکی اور تاریکی کا جو انداز ملتا ہے اُسے اگر کوئی نسبت ہوسکتی ہے تو وہ شوکت، جلالؔ اور آسیرؔ جیسے مغل دور کے شعرائے متاخرین سے ہوسکتی ہے مگر ان کی ابہام پسندی اور دقت نوازی کی مرزا دیں تقلید بھی اس تجرباتی دور میں مرزا نہیں کرسکے، ان شعرا کے یہاں بے مزگی ضرور ہے پیچیدگی بھی ہے تفکر اور تخیل کی گرہ بازیاں بھی انہیں عزیز ہیں لیکن ان کا رنگ بہر حال استادانہ ہے اس کے برعکس مرزا کی ابہام پسندی اور وہ بھی اُردو شاعری میں اس سے بھی کچھ آگے نکل جاتی ہے۔ اس کا اندازہ نسخہ حمیدیہ میں شامل ان اشعار سے ہو سکتا ہے جو قلمزد کئے گئے تھے۔

پُرگوئی اور بے مصرف سخن آرائی یا نقل لفظ کے طور پر کہے جانے والے اشعار کی ایک بڑی تعداد دوسروں کے یہاں بھی ملتی ہے اور خاص طور پر اُردو شعراء میں لیکن معنی سے بیگانہ شعر اور وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں مرزا کے علاوہ پوری اُردو شاعری کی تاریخ میں شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے کہے ہوں۔

معنی سے قطع نظر زبان و بیان کے اعتبار سے بہت سے شعر ایسے ہیں کہ ان کا ایک آدھ لفظ اگر بدل دیا جائے تو وہ اُردو کے بجائے فارسی کے شعر بن جائیں۔ مرزا نے ایسا کیا بھی ہے اور اس کی ایک مثال کے طور پر مولینا حالیؔ نے اس شعر کو پیش کیا ہے۔

(اُردو) کرے گر فکر تعمیر خرابِ ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخوان بیرون زمالبہا

(فارسی) کند گر فکر تعمیر خرابیہائے دل گردوں
نیاید خشت مثل استخواں بیرون زمالبہا

لیکن اس تبدیل صورت کے بعد بھی کیا الفاظ کی استخواں بندی کے اس قالب بے جاں میں لطف زبان اور حسن معنی کی روح پھونکی جاسکی!؟ اور اس انداز شعر گوئی کو خود فارسی کی اعلیٰ شاعری کے مقابلہ میں کیا درجہ دیا جاسکتا ہے؟!

اس قسم کی بے رنگ خیال آرائی اور بے روح وقت نوازی کو مرزا کی غیر معمولی طبعی اپج اور بے مثال ذہانت کا اظہار سمجھا گیا ہے حالی اور بعض دوسرے نقاد بھی سمجھے اور سمجھاتے رہے ہیں۔

"مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے ان کی اوریجنیلٹی (ORIGNALTY) اور غیر معمولی اپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔" لہ

لیکن ان مہمل و بے معنی اشعار سے بھی اُن کی شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ معلوم نہیں ایسی صورت میں ان شعراء کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو باقاعدہ "معمے" اور "چیستاں" لکھتے تھے۔ نیز اس موقع پر اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دور جب مرزا اس مشکل گوئی اور وقت نوازی کو اپنا خاص "شیوۂ گفتار" بنائے ہوئے تھے

لہ یادگارِ غالب ص ۱۰۰

وہ اُردو زبان وادب میں نت نئے تجربات کا دور ہے (ایسے دور مختلف زبانوں کی ادبی تاریخ میں آتے رہتے ہیں اور ظاہری رُخ کے اعتبار سے زبان و ادب کی ترقی اور باطنی پہلو کے لحاظ سے رُوح معنی کے زوال کی نشان دہی کرتے ہیں) انشاء اس دور میں نہ صرف یہ کہ ایک غیر منقوط قصیدہ لکھتے ہیں بلکہ "سلک گوہر" کے نام سے ایک پوری کہانی اُردو نثر میں بے نقط لکھ دیتے ہیں، اپنے ایک اُردو قصیدہ میں فارسی وعربی کے علاوہ بعض دوسری ہندوستانی اور غیر ہندوستانی زبانوں میں شعر کہہ کر داخل کرتے ہیں اسی کے ساتھ رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی داستانِ عشق ایک ایسی زبان میں ترتیب دیتے ہیں جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ نہ آئیں۔ ان کی بحر طویل میں لکھی جانے والی غزل بھی ایسے ہی انوکھے تجربوں میں داخل ہے ان کے ساتھیوں میں قتیل اور رنگین کی طبع ایجاد پسند بھی شعور وشعر کی دنیا میں نت نئے گل کھلا رہی تھی، دیاشنکر نسیم کی اختصار نگاری کو بھی میر حسن کے اسلوبِ بیان کے مقابلہ میں ایک نیا تجربہ کہا جائے گا۔ سنگلاخ زمینوں میں دریائے سخن کی روانی کا تماشہ دیکھنے کے لئے مصحفی اور ان کے معاصرین جن ذہنی کاوشوں میں مصروف تھے ان کی حیثیت بھی کچھ آزمائشی تجربوں کی سی تھی غالب کے مشکل پسندانہ طریقِ فکر اور اسلوب ادا کو بھی اس سلسلۂ تجربات سے الگ نہیں کہا جا سکتا۔ اب اسے اُردو زبان وادب کی تاریخ کا ایک المیہ ہی کہا جائے گا کہ دوسروں کے تجربات اپنے اپنے دائرہ میں جس حد تک کامیاب اور قابلِ قبول رہے مرزا کا تجربہ اپنی خاص حدود میں اتنا ہی ناکام رہا۔

اس ضمن میں اس پہلو سے بھی کلیتاً صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ مرزا نے اپنی اس روش کو زندگی میں اپنے عہدِ شباب کی بے راہ رویوں کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

"با فردِ فرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن با فرومایگان ہم نشیں و با اوباش ہم رنگ پائے بے راہبر پوے و زبان بے صرفہ گوئے"[1]

ممکن ہے اسے ایک رسمانی انداز فکر سمجھا جائے لیکن خود مرزا اپنی اسی بے راہ روی اور بے صرفہ گوئی کو دو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹتے اور اس کا اقرار کرتے ہیں:

آزردہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں پیروی کرتا رہا جو راہِ صواب سے نابلد تھے[2]

حالی نے ان کے ایسے کچھ اشعار نقل کرتے ہوئے لکھا ہے ـــــ

"قطع نظر اس کے کہ طرز بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے، خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں سے نقل کی ہیں جو انھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اس میں سے نکال ڈالی تھیں مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے[3]

یہ صحیح ہے کہ مرزا نے اپنے ایسے اشعار اور غزلیات کو نظری قرار دیا لیکن ان اشعار کو غالب کے علاوہ کسی اور سے منسوب نہیں کیا جا سکتا اور غالب کے فن اور ارتقائے فن پر گفتگو کے وقت تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ فکر کے اعتبار سے ان سے صرف نظر ممکن نہیں۔ بالخصوص اس لئے کہ اس طرزِ فکر کا اثر ان کی پوری اُردو شاعری پر مرتب ہوا ہے۔ حالی کے اعتراف کے مطابق ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار ہنوز باقی ہیں۔

علاوہ بریں اس ذہنی رویہ کا اثر ان کی شاعری پر تا بہ دیر رہا ہے، حالی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

---

[1] یادگارِ غالب ص ۹۸، [2] یادگارِ غالب ص ۱۸۲، [3] یادگارِ غالب ص ۹۹،

"اگرچہ مرزا نے بیدل اور ان کے متبعین کی زبان اور انداز بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا مگر خیالات میں بیدلیت مدت تک باقی رہی"۔[1]

اس طرز فکر اور اسلوب ادا کا اثر ان کی اردو شاعری میں جن پہلوؤں سے آیا ہے ان میں ایک نمایاں صورت سلسلۂ اضافت بھی ہے، جس نے ان کے لب ولہجہ کو اردو لب ولہجہ سے بہت دور کر دیا ہے ـــ

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

شب خمار چشم ساقی است خیر اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

جاں در ہوائے یک نگہ گرم ہے اسد
پروانہ ہے وکیل ترے داد خواہ کا

کوہ کن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

برنگ کاغذ آتش زدہ نیرنگ بیتابی
ہزار آئینہ دل باندھے بال یک طپیدن پر

ان اور ان جیسے بہت سے شعروں میں عطف و اضافت کا جو سلسلہ ہے اس نے اردو زبان اور اردو غزل کے لب ولہجہ کو پابہ زنجیر کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کے معاملہ میں غالب کا یہ انداز نظر بالکل رجعت پسندانہ ہے وہ اردو زبان کی آزاد حیثیت کے قائل نہیں معلوم ہوتے یہ کہنا کہ انہیں پابندیوں کی وجہ سے اردو زبان نئے ادبی افکار و اقدار سے آشنا ہوئی کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے خود غالب کے بہترین اردو اشعار وہ ہیں جو زبان کے اس ثقل سے آزاد ہیں، اردو زبان کا تو خیر مزاج ہی دوسرا ہے خود فارسی میں توالی اضافت کی ایسی صورتیں شعر کا حسن نہیں عیب ہیں۔

مرزا نے اردو میں بالعموم سنگلاخ زمینوں میں شعر نہیں کہے لیکن جب بھی اس کی کوشش کی ان کے یہاں جذبے کی وہی بے کیفی اور خیال کی بے لطفی ابھر آئی جو اس رہگزار میں قلم کے ٹھوکریں کھانے اور خاک اڑانے کا نتیجہ ہوا کرتی ہے ـــ؛

مرے سبو میں ہے صہبائے آتش پنہاں
بروئے سفرہ کباب دل سمندر کھینچ

کمال گرمیٔ سعی تلاش دید نہ پوچھ
برنگ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

کافی ہے نشانی تری چھلے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقت سفر انگشت

مرزا دہلی کی بولی ٹھولی اور بامحاورہ زبان کو اپنی فارسی کے مقابلہ میں ہیچ پوچ سمجھتے تھے اسی لئے انھوں نے ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہا تھا

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

اس پر بھی انھوں نے اپنے یہاں محاوروں کو جگہ دی لیکن اکثر یہ محاورے ان کی فارسیت کے ساتھ ان مل بے جوڑ نظر آتے ہیں اور اردو لب ولہجہ کی شیرینی اور زبان کی گھلاوٹ باقی نہیں رہتی۔

ع

---

[1] یادگار غالب ص ۱۰۴،

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یہاں کیا دھرا ہے قطرہ موج و حباب میں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

پہلے شعر میں نمود صور، وجود بحر، اور قطرہ و موج و حباب جیسی ترکیبوں کے ساتھ یہاں کیا دھرا ہے جیسے الفاظ کا جوڑ ایک طرح کی پیوند کاری ہے جو زبان غزل بلکہ خود اُردو زبان کے صحیح مزاج سے میل نہیں کھاتی، دوسرے شعر میں فکر کی سنجیدہ فضا کو جو ایسے مسائل پر گفتگو کا تقاضہ ہے ڈبویا مجھکو ہونے نے جیسے فقرہ نے بدل دیا ہے نے نے کی تکرار ایک گونہ صوتی کراہت پیدا کرتی ہے صوتی بدآہنگی کا یہ پہلو مرزا کے بعض اشعار میں بے طرح نمایاں ہے ؎

مارا زمانہ نے اسد اللہ خاں تمہیں
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی

داں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
جو کہ کھایا خون دل بے منت کیلوس تھا

لڑتا ہے مجھسے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا

ان کے مقابلہ میں مرزا کے یہاں ایسے شعر بھی ہیں جو اپنے انداز بیان سے زیادہ طرز خیال کے اعتبار سے مذاقِ لطیف پر گراں گزرتے ہیں۔

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یہاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

دیوار زنداں پر دیدۂ یعقوب کی سفیدی پھرنا رعایت لفظی کی ایک کراہت آمیز مثال ہے۔

ع

دھوتا ہوں جبکہ پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

پاؤں دھو کے پینا ایک محاورہ تھا مرزا نے اپنے انداز بیان سے اسے حقیقت بنا دیا جس سے اس کی بے لطفی اور بڑھ گئی۔

غالب کے یہاں ناسخ و نصیر کے اتباع کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں اور نسخۂ حمیدیہ میں تو ایسی بہت سی غزلیں ہیں جو اسی رنگ بے رنگ میں کہی گئی ہیں اس پر بھی وہ ناسخ و نصیر کی طرح زبان کے رکھ رکھاؤ کا خیال نہیں رکھتے انھوں نے اپنے یہاں ایسے الفاظ کو جگہ دی ہے جو غزل کے رنگ و آہنگ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، ان مصرعوں کو دیکھئے ؎

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا

مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہئے

علاوہ بریں ان کے اس منتخب دیوان میں بھی اچھی خاصی تعداد میں وہ اشعار موجود ہیں جو لطف محبت یا نقل محفل کے طور پر تو کام آسکتے ہیں لیکن اعلیٰ شاعری کا نمونہ نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی
کبھی کودکی میں جسنے نہ سنی مری کہانی

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ردنے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

یہ صرف مرزا کی شوخیٔ طبع نہ تھی جو ان کے یہاں مزاح و مذاق کی سی یہ کیفیت پیدا کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ اُردو زبان کے معاملہ میں بہت کم سنجیدہ انداز فکر کو اپنا سکے خود انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی طرف واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ وہ اپنی اُردو تخلیقات سے شرماتے ہیں منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھتے ہیں ــــــ

"بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں یہ غزلیں کاہیکو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں میرے فارسی قصیدے جن پر مجھکو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اٹھاتا" [۱]

یہی بات خود حالی کی زبان پر آئی ــ

یہ امر جتا دینا ضروری ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر..... ایک آدھ غزل کہہ لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے اردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنعت بقدر معتد بہ نہیں پائی جاتی [۲]

---

[۱] یادگار غالب ص ۱۰۶، [۲] یادگار غالب ص ۱۰۶

نثار احمد فاروقی

مطالعۂ غالب
اور
آثر لکھنوی

نواب مرزا جعفر علی خاں آثر لکھنوی مرحوم اس دور میں دبستانِ لکھنؤ کی آبرو تھے، پرگو اور قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ محاورہ و مصطلحات پر ان کی عالمانہ نظر تھی۔ انھوں نے نظم و نثر میں مختلف اصناف اور موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے۔ تنقید ادب و شعر کے موضوع پر ان کی مطبوعہ کتابوں میں "آثر کے تنقیدی مضامین"، "چھان بین"، "مطالعۂ غالب" اور "انیس کی مرثیہ نگاری" خاص وقعت و اہمیت رکھتی ہیں۔ فی الوقت ہمارا موضوعِ سخن حضرت آثر کی ناقدانہ حیثیت سے بحث کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی کتاب "مطالعۂ غالب" سے متعلق ان کی کچھ وضاحتیں پیش کرنا ہے اس لئے غیر ضروری تمہید کو ترک کیا جاتا ہے۔

"مطالعۂ غالب" ایک مختصر سی کتاب ہے جو پہلی بار ۱۹۵۲ء میں دانش محل، لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں حضرت آثر لکھنوی نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں غالب کے چیدہ چیدہ اشعار کی وضاحتیں پیش کی ہیں اور شارحین متقدمین سے اختلاف کرتے ہوئے وہ معانی بیان کئے ہیں جو حضرت آثر کے خیال میں زیادہ قابلِ قبول ہیں۔ اس مختصر کتابچے کی اہمیت سہ گونہ ہے۔ پہلی تو یہ کہ حضرت آثر جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس میں غالب اتنا مقبول نہ تھا جتنا آج ہے۔ اور نظم طباطبائی کی شرح چھپنے سے پہلے تو لکھنؤ والے بالعموم غالب کو "مہمل گو" سمجھتے تھے۔ ان کے مذاقِ سخن کی تربیت ناسخ، آتش، جلال، امیر، وزیر، صبا، رند، سحر، رشک، امیر، مضطر وغیرہ کے رنگ کلام سے ہوئی تھی۔ دبستانِ دہلی کے شعرا میں میر، سودا اور درد کو خیر الآباء تھے۔ عہد متوسطین میں شاہ نصیر اور ذوق کی قافیہ پیمائیاں اہلِ لکھنؤ کو زیادہ متاثر کرتی تھیں۔ اس لئے جب کبھی ایسا تفصیلی مطالعہ کیا جائے گا جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ غالب کی شاعری کا ردِ عمل اور اس کی پذیرائی یا تفہیم کن مدارج سے گزری ہے اور اس کا عہد بہ عہد ارتقا کس طرح ہوا ہے تو دبستانِ لکھنؤ کا ردِ عمل اور غالب فہمی کی طرف رجعت کے سلسلے میں نظم طباطبائی کی شرح کے بعد دوسری مفید کتاب مطالعۂ غالب ہی ہوگی۔ حضرت آثر نے خود مجھے ایک خط میں لکھا تھا کہ :-

"مجھ میں تنقید کا عشق میرے چچا صاحب مرحوم

نواب ولادر حسین خاں نے پیدا کیا۔ وہ میری
دادی کے بھائی کے فرزند تھے۔ اس زمانے
میں جس کو اب ساٹھ برس ہوئے ہوں گے،
غالب کی کوئی شرح شائع نہیں ہوئی تھی اور
مہمل گو سمجھا جاتا تھا۔ چچا صاحب مرحوم اس
کے اشعار کے وہ معنی بیان کرتے تھے کہ
باید و شاید۔"

دوسری اہمیت یہ کہ حضرت اثر کی میر پرستی ضرب المثل
کی طرح مشہور ہو گئی تھی، اور بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ
وہ میر و غالب کا موازنہ کرتے ہوئے میر کی طرف داری کرتے
ہیں۔ اثر صاحب کی تحریروں میں ایسے متعدد مواقع آئے
ہیں جہاں سخن گسترانہ پیرائے میں بھی انھوں نے میر و غالب
کے ہم معنی اشعار کا موازنہ کیا ہے لیکن میر کا تفوق ثابت
کرنے کے لئے کبھی ہٹ دھرمی یا غیر مناسب جذبہ داری کا
مظاہرہ نہیں کیا۔ اس کتاب میں جیسی دقت نظر اور ژرف بینی
سے انھوں نے کلام غالب کے محاسن اجاگر کئے ہیں اس
سے ایک طرف تو ان کی سخن فہمی اور نگاہ کی تہہ رسی کا اندازہ
ہوتا ہے، دوسری طرف غالب کی شاعری پر ان کی جچی تلی رائے
بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ اور تیسری اہمیت یہ ہے کہ بعض اشعار
میں انھوں نے واقعی ایسے پہلو تلاش کئے ہیں جن پر کسی
شارح کی نگاہ نہیں پہنچی تھی۔

میں نے حضرت اثر کی کتاب "مطالعۂ غالب" پڑھ کر ہی
پہلا خط ان کی خدمت میں بھیجا تھا جس کا انھوں نے بڑی
شفقت اور محبت اور عالی ظرفی سے جواب لکھا۔ اس کے
بعد یہ سلسلۂ مراسلت ان کے زمانۂ رحلت تک جاری رہا،
ان کے خطوط جو میرے پاس محفوظ رہ گئے ہیں ہر لحاظ سے
قابل قدر ہیں، توفیق ایزدی شامل رہی تو انہیں مقدمہ و حواشی
کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ یہاں صرف ان
خطوط کے اقتباسات پیش کرتا ہوں جو "مطالعۂ غالب" کے سلسلے
میں لکھے گئے تاکہ ان وضاحتوں کی روشنی میں مطالعۂ غالب کے
کے بعض مطالب اور بھی روشن ہو جائیں۔

(۱)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

۸ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرم بندہ۔ سلام شوق۔

خط ملا۔ آپ کے استفسارات سے ناراض ہونا کیسا، خوشی ہوئی،
ایسے مباحث میں اگر ذاتی پرخاش یا عناد کو راہ نہ ہو تو فائدہ
ہی فائدہ ہے۔ آپ کا خط خلوص کا آئینہ دار ہے۔ آمدم
بر سر مطلب!

۱۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

حالی کے بیان کردہ مطالب پر دوبارہ غور کیجئے:۔

(الف) جس دشت میں ہم ہیں اس قدر ویران ہے
کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے،
(آپ کے راو را اتنا اضافہ کرنے کی اجازت دیجئے کہ میرے)
علی الرغم انھوں نے دشت کی ویرانی کو گھر کی ویرانی پر ترجیح
دی۔ وشت سے خائف ہونا اس کا غماز ہے۔

(ب) "ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں
نہ ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر
کی ویرانی یاد آتی ہے (کم سے کم گھر اور دشت مساوی درجے
میں ویران ہیں، گھر کی ویرانی کی دشت کی ویرانی پر افضلیت
ثابت نہیں ہوئی اور اس کے بغیر شعر بلند نہیں ہوتا)

ان مطالب پر میرا پہلا اعتراض یہ ہے کہ گھر کو چھوڑ کر
دشت گردی اختیار کرنے کی توجیہہ مفقود ہے۔ میں نے اس

کی وجہ بیان کی: "وحشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی
جو گھر سے زیادہ ویران ہو، لہٰذا دشت کا رُخ کیا۔ وہاں
پہنچ کر اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں، اس سے زیادہ
تو خود میرا گھر ویران ہے۔" (اور گھر کی طرف مراجعت کی)
بعد ازاں میں نے یہ استدلال کیا ہے "ویرانی سی ویرانی" کے
پیشتر لفظ "کوئی" نہ ہوتا تو شدید ویرانی کا مفہوم ادا ہوتا۔
لفظ کوئی کے اضافے نے ویرانی دشت کی تنکیر یا تنقیص کردی۔
حاصل کلام، مطلب وہی نکلا جو آپ نے بیان کیا ہے۔
یعنی غالب نے اپنے گھر کی ویرانی کا نقشہ کھینچا ہے اور دشت
کے بالمقابل (جو ویرانی کے لئے ضرب المثل ہے) اپنے گھر کو
زیادہ ویران ثابت کیا ہے۔

۲۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

آپ کا فرمانا بالکل درست ہے کہ جگر تشنہ (یا تشنہ جگر)
اور تشنہ ہم معنی ہیں۔ مگر میں عرض کروں گا کہ ہر جگہ نہیں مثلاً
"تشنۂ خوں" کے بجائے "تشنہ جگر خوں" یا "جگر تشنۂ خوں" لانا
غلط ہوگا تشنہ یا تشنہ جگر (جگر تشنہ ترکیب مقلوب) کے
مجازی معنی کثرت سے آرزومند ہوتا ہیں۔ غالب نے صرف
جگر تشنہ کو نہیں بلکہ جگر تشنۂ فریاد کو دل کی صفت قرار دیا
ہے۔ جس کے معنی میری ناچیز رائے میں اس کے سوا نہیں ہو سکتے
کہ "دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ہونے کے درپے ہوا"

۳۔ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر پر آپ کا اعتراض آپ کی دقتِ نظر پر دلالت کرتا
ہے، میں نے اس شعر کو کبھی وقعت نہیں دی مگر مجھے اعتراف
ہے کہ جو اعتراض آپ نے وارد کیا ہے کبھی نہیں سوجھا[1] شعر
میں کوئی نکتہ پہلے پنہاں معلوم ہوا نہ اب معلوم ہوتا ہے،
شاید ہے بھی نہیں، صرف متناسب الفاظ جمع کر دیے گئے
ہیں۔

مجھے سعادت علی امروہوی کے متعلق اتنی تحقیق بھی نہیں جتنی
آپ کو ہے[2]۔ والسلام آثر

(۲)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۱۹ر ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی۔ تسلیم

عنایت نامہ مل گیا، بہت بہت شکریہ

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

میں نے آپ کے بیان کردہ مطلب پر غور کیا۔ میں باادب
عرض کروں گا کہ میری شرح کا یہ جملہ اب بھی تشنۂ جواب
ہے: "فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے؟"
آپ کا فرمانا ہے کہ "دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کر رہا

---

[1] میں نے شاید یہ لکھا تھا کہ لفظ "لڑکپن" کا استعمال درست نہیں، یہ عمر کا وہ حصہ ہوتا ہے جس میں اتنی مآل اندیشی اور عاقبت بینی نہیں ہوتی جو شاعر کا مقصود ہے۔

[2] سید سعادت علی سعادت امروہوی جن کا حوالہ "ذکر میر" میں ملتا ہے اور میر نے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے مجھے ریختہ موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ میں نے سعادت کے حالات اور کلام مختلف تذکروں سے فراہم کر کے ایک مضمون لکھا تھا جو دلی کالج میگزین کے میر نمبر میں شامل ہے۔

ہے اور مجھے اپنا دیدۂ تر یاد آرہا ہے کہ وہ اس کی پیاس بجھائے" فریاد کی شدید پیاس ہوئی۔ فریاد کی شدید خواہش اس کی تسکین رونے سے کیوں کر ہو سکتی ہے؟ فریاد کی خواہش فریاد کرنے سے پوری ہو سکتی ہے اور اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ مزید برآں کسی کی یاد آنا اس کی دلیل ہے کہ وہ اس وقت موجود نہیں۔ دیدۂ تر کا یاد آنا یہ ہوا کہ آنکھیں ہیں مگر آنسو نایاب ہیں۔ لفظ "پھر" سے اس طرف اشارہ ہے کہ آنکھیں پہلے ہی اتنا رو چکی ہیں کہ آنسو خشک ہو گئے، اب آنسوؤں کا قحط ہے۔

میری شرح میں آپ کے اس اعتراض کا جواب موجود ہے کہ "دل جگر کے خون ہونے پر آمادہ ہو گا تو دیدۂ تر کیا کریں گے؟" آنکھیں بجائے اشکوں کے جگر کا خون روئیں گی شرح کے الفاظ یہ ہیں :۔

"دل جو بیتاب گریہ تھا مصر ہوا کہ آنکھ میں
آنسو نہیں تو فریاد کر کے جگر کا خون کرو اور
اس خون کے آنسو روؤ۔ میری تشنگیٔ شوق
کی تسکین بہر صورت ہونا چاہیئے"۔

کیا غلط ہو گا اگر عرض کروں کہ میری شرح کا آخری جملہ کہ "فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے"؟ ہنوز تشنۂ جواب ہے؛ اور آپ کی مزید توجہ کا محتاج۔ یقین مانیئے کہ یہ میری ہٹ دھرمی نہیں بلکہ آپ کے فرمودات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے لیے عرض کر رہا ہوں۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ میری پیش کردہ شرح اشعار غالب کا غائر مطالعہ فرما رہے ہیں اور اپنی مجموعی رائے سے مطلع کریں گے، آپ انشاءاللہ دیکھیں گے کہ اپنے تسامحات سے آگاہ ہونے پر ان کا فراخ دلی سے اعتراف کروں گا . . . . .

نیازمند :۔ آثر

(۳)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۲۴ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرّمی تسلیم

گرامی نامہ موصول ہوا ؎

ہے بزم بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

آپ کے دونوں بیان کردہ مطالب میں لبوں کو خوشامد طلب فرض کیا گیا ہے۔ یہ امر مستبعد ہے۔ لب خوشامدی ہو سکتے ہیں۔ خوشامد طلب نہیں ہو سکتے جس کا مطلب ہے خوشامد کا خواہاں یا متوقع ہونا۔ لبوں کو گفتار سے تو ربط ہے مگر سخن سے طلب خوشامد کیوں کر کریں گے؟ سخن کا لبوں سے آزردہ ہونا، باہمی رشتہ منقطع ہو جانا ہے۔ جس کا مآل خامشی ہے۔ چونکہ بت خاموش رہتے ہیں لہٰذا ان کی بزم اور ان کے تتبع میں سخن بھی لبوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے، روٹھ جاتا ہے۔

حسرت و میر کے اشعار کا مفہوم غالب سے بالکل مختلف ہے۔[1]

میر کہتے ہیں کہ معشوق کا سامنا کبھی ہوتا تو کیا ہوتا منہ سے بات بھی نہ نکلتی۔ اس کا سبب رعب حسن ہو یا محویت دیدار یا افراط شوق یا شدت اضطراب یا ان سب کا مجموعی اثر

---

[1] میں نے یہ لکھا تھا کہ شعر میں "خوشامد طلب" صفت لبوں کی معلوم ہوتی ہے یعنی جب بزم بتاں میں پہنچے تو لب و سخن ایک دوسرے سے بیگانے ہو گئے اور سخن بار بار لب تک آنا چاہتا ہے مگر لب اسے قبول نہیں کرتے (گویا بلا نہیں جاتا) حضرت آثر کا فرمانا تھا کہ "بتاں" کی صفت ہے۔ میں اس سلسلے میں ابھی تک متامل ہوں۔

حسرت کہتے ہیں کہ بنائے احتیاط اظہار مدعا نہ ہوا، مبادا
معشوق ناراض ہو یا عشق کی تذلیل کرے، مضحکہ اڑائے اور
کہے "یہ منہ اور خشکہ!"
گستاخی منزور ہے مگر مفہوم سے ملتے جلتے اپنے چند
شعر پیش کرنے کی جراءت کرتا ہوں ؎

کبھی اظہار مدعا نہ ہوا
عشق غیرت سے لب کشا نہ ہوا

جب کہا اس نے مدعا کہیے
سوچتے رہ گئے کہ کیا کہیے

نظریں اٹھیں اور اٹھ کے جھکیں تمکنت کے ساتھ
گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا

وہ غور بات بات پہ وہ شک بھری نظر
یارب نہ مجھ سے صاف ہو دل بدگمان کا

اس کا کہنا کہ جو کہنا ہے کہو جلد یہاں
بات کا طول کسی طرح گھٹائے نہ بنے

۲۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

ورنہ کا لفظ بھرتی کا نہیں ہے بلکہ مخاطب کے خیال کی تردید
کرتا ہے "اے غافل رموزِ معرفت سے بیگانہ تو سمجھتا ہے کہ میں
معدوم ہوں۔ نہیں، میں اس سے بھی بالاتر منزل میں ہوں،
جہاں وجود و عدم کا فرق اور تضاد مٹ گیا ہے۔ غالب کا
شعر فلسفیانہ ہے اس کو مجازی عشق کے معاملات سے منسوب
کرنا شاید درست نہ ہو، اس میں غافل سے مراد معشوق نہیں
ہے۔ لہٰذا معشوق کا آہوں کی بے اثری پر طعنے دینے کی بھی
گنجائش نہیں بلکہ ایسا شخص مخاطب ہے جو وجود و عدم کے
کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہے۔

جراءت گفتار پہ معافی کا خواستگار ہوں۔

آپ کو یہ وہم کیوں کر ہو گیا کہ آپ بدخط ہیں آپ کے
خط میں ترنجستگی کے باوصف صفائی[1] ہے جس سے ثابت ہوتا
ہے کہ آپ صاحب علم و فضل ہوتے ہوئے بھی ملائیت
سے کوسوں دور ہیں۔ ملائیت بیشتر نفاست سے دور
ہوتی ہے یہ حال کم علمی کا بھی ہوتا ہے۔

نیازمند
اثر

(۳)

کشمیری محلہ، لکھنؤ
۲۵ ستمبر ۱۹۵۲ء

مکرمی تسلیم

عنایت نامے کا بہت بہت شکریہ ؎

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

میں اب تک یہ سمجھتا تھا کہ فریاد کا مفہوم داد خواہی کے
لئے شور و غل مچانے، دہائی دینے تک محدود ہے۔ اسی سے

---

[1] حضرت اثر کا خط بہت پاکیزہ اور صاف تھا معہذا اس میں یکسانی اور یکرنگی تھی۔ اس اعتبار سے میرا خط یقیناً اچھا نہ تھا ان جملوں کو غیر متعلق سمجھ کر حذف کرنا چاہتا تھا لیکن طرزِ بیان کی جامعیت اور استدلال میں جو لطف ہے اس میں دوسروں کو شریک نہ کرنا خود غرضی معلوم ہوتی۔

میری مطبوعہ شرح کا آخری جملہ یہ تھا کہ "فریاد کی تسکین گریہ سے کیوں کر ہو سکتی ہے"۔ اگر فریاد میں گریہ وزاری بھی شامل ہے تو آپ کے بیان کردہ مطلب کی صحت میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ مگر مزید اطمینان کر لیجیے۔ میں اس باب میں آپ سے متفق نہیں اور ـــــ مزید بحث کا بھی دم نہیں[1]

شاید میں اپنے پچھلے عریضے میں سہواً یہ لکھ گیا کہ "دل خون جگر کو آنسو بنا کر بہلنے پر مصر ہوا تا کہ اس کی تشنگیِ فریاد فرو ہو سکے" (یہ عبارت آپ کے خط سے نقل کی ہے۔ میرے پاس مسودہ محفوظ نہیں) میرا منشاء ابتدا سے یہ رہا ہے کہ دل فریاد کا نہیں بلکہ رونے کا مقتضی ہوا، مگر میں پہلے ہی اشارہ کر چکا تھا کہ آنکھوں میں قحطِ اشک تھا، یہ حالت دیکھ کر دل مصر ہوا کہ نایابیِ اشک پر فریاد کر کے جگر کا خون کرو اور اسی خون کے آنسو رو دو۔ میری تشنگیِ شوق (گریہ) کی تسکین بہر صورت ہونا چاہیے۔ اگر جگر تشنۂ فریاد سے یہ مراد ہے کہ دل فریاد کی شدید پیاس محسوس کرنے لگا تو بھی آپ کا بیان کردہ مطلب درست ہے۔

خصوصاً جب دیدۂ تر کا یاد آنا بر بنائے نایابیِ اشک نہیں ہے بلکہ برائے تجدید گریہ ہے اور اس میں خشکیِ اشک کا مفہوم مضمر نہیں ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں "جگر تشنۂ فریاد" کو ایک لفظ تصور نہیں کرتا، غالباً مجھ سے پھر ہنگام تحریرِ عریضۂ سابق لغزش ہوئی ورنہ مطبوعہ شرح میں یہ جملہ موجود ہے! "جگر تشنۂ فریاد ترکیب مرکب ہے"۔ فرق ہمارے مابین اس ترکیب کے مفہوم پر ہے۔ آپ اس سے دل کی شدید پیاس مراد لیتے ہیں اور میں دل کا بذریعۂ فریاد خون کرنے کا مطلب نکالتا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ اگر فریاد میں گریہ شامل ہے اور دیدۂ تر کے یاد آنے میں خشکیِ اشک کی طرف لفظِ "پھر" سے اشارہ نہیں ہے تو آپ کی شرح صرف صحیح نہیں بلکہ صاف اور میری شرح کی طرح پیچ در پیچ نہیں ہے۔

یہ گتھی یوں بھی سلجھ سکتی ہے کہ کچھ آپ سمجھیں، کچھ میں سمجھوں۔ آپ یہ مان لیں کہ دیدۂ تر کا یاد آنا یہ ہے کہ آنکھ میں آنسو نہیں مگر رونے کی شدید خواہش ہے۔ میں یہ مان لوں کہ اس نایابیِ اشک پر دل شدتِ عطش سے فریاد کرنے لگا یعنی "جگر تشنۂ فریاد" کے وہی معنی ہیں جو آپ نے لیے، فریاد کی شدید خواہش یا پیاس۔ کہیے یہ شرائطِ صلح آپ کو منظور ہیں؟

.... مومن کا جو شعر آپ نے نقل کیا ہے میں نے کبھی اس کی شرح کی تھی: "مومن آج کل کے مولویانہ مذاقِ سخن رکھنے والوں میں اس شعر کی بنا پر بہت بدنام ہے۔

لے شبِ وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

یہ لوگ نہیں سمجھتے یا سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ شعر کا حاصل کیا ہے۔ کوئی بے غیرت سی بے غیرت بازاری عورت بھی اپنے چاہنے والے سے نہ کہے گی کہ آج شبِ وصلِ غیر ہے چلتے بنیے۔ یہ صرف معشوق کی شوخی ہے کہ مومن کے آزمانے کو ایک جھوٹی اور فرضی بات کہتا ہے۔ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اگر اس کو در اصل مجھ سے محبت ہے تو سخت سے سخت آزمائش میں بھی پورا اترے گا اور اس سے زیادہ سخت

[1] اس جملے سے مجھے شبہ ہوا تھا کہ شاید حضرت آثر میرے کسی جملے سے ناراض ہو گئے۔ آئندہ خط نمبر (۶) میں اسی شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے۔

آزمائش کیا ہوگی کہ وصلِ غیر کی طرف اشارہ کروں۔ چنانچہ ایسا ہی
ہوتا ہے اور مومن دوسرے دن کہتا ہے کہ ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی !

دوسرے مصرع میں لفظ "آزمانے" سے جتا دیتا ہے کہ
وصلِ غیر محض افسانہ تھا، میرے آزمانے کو ایک حیلہ تراشا گیا تھا

ہوا ہے نہ تو اور نہ ہوگا کسی کا

مگر باتوں باتوں میں کبھی غیر سے بھی کہہ دے کہ آج مومن کی
شبِ وصل ہے، پھر دیکھ اس کا کیا حال ہوتا ہے، اگر امتحان
میں ثابت قدم نکلے تو خطِ غلامی لکھتا ہوں"۔ ؂۱
بہت سمع خراشی کی۔ امیدوارِ عفو ہوں۔ — آثر

(۵)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۲۹ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی تسلیم

۲۷ ماہ حال کا گرامی نامہ ملا جس خط کا آپ نے ذکر کیا ہے
اس کا جواب ارسال کر چکا ہوں۔ امید ہے مل گیا ہوگا ؎

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

بتاں بعینہٖ جمع اکثر شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اس سے عموماً یہ
مراد ہوتی ہے کہ جس خصوصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب ....
معشوقوں (بتوں) میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے، مثلاً میر
کے یہ اشعار — !

؎ لطف اگر یہ ہے بتاں صندل پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

؎ بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

غالب کے شعر میں بزمِ بتاں سے یہ مطلب نکلا کہ ہر
بت (معشوق) کی بزم میں یہ عام دستور ہے کہ سخن لبوں سے
آزردہ رہتا ہے (لب آشنائے گفتار نہیں ہوتے) سخن
کا لبوں سے آزردہ ہونا یہ ہے کہ سخن میں اور لبوں میں رابطہ
نہیں رہتا۔ علاوہ بریں بعض مواقع پر کثرت کا اطلاق مجموعہ کی
ہر فرد پر ہوتا ہے۔ جمع سے واحد مراد لی جاتی ہے۔ کسی خط میں
یہ عرض کر چکا ہوں کہ خوشامد طلبوں سے بجائے معشوق کے
لبوں سے مراد لینا میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔ لہٰذا

(LET US AGREE TO DIFFER)

۲۔ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

آپ فرماتے ہیں کہ رموزِ معرفت کے آشنا (سالک و مجذوب)
کو آہِ آتشیں سے کیا علاقہ۔ تصوف کا دارو مدار عشق پر ہے،
(عشقِ حقیقی۔ بندے کا عشق خدا سے)۔ جب تک رنجِ مہجوری
ہے آہ و زاری ہے۔ غالب اس شخص کو جو حقیقت سے
نا آشنا ہے اور ان کے ترکِ آہ و نالہ کو مایوسی اور بے تاثیری
پر محمول کرتا ہے، مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اب میں اس منزلِ فنا
میں ہوں جو عدم سے بھی ماورا ہے۔ فنا کی زد میں بھی فنا ہوگئی جب
منزلِ عدم میں تھا تو احساسِ دوری تھا اور آہ کرتا تھا اور
آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ عنقا کے بال و پر جل جاتے تھے۔ عدم کی
منزل سے بالاتر ہو جانے کے بعد تفریقِ فنا و بقا مسدود ہوگئی تو اب آہ
کی کیا ضرورت رہی۔ میں نہ تو سالک ہوں نہ مجذوب، البتہ
مسائلِ تصوف سے آگاہی کا شغف ہی نہیں رہا ہے بلکہ،
(باوجود شیعہ ہونے کے) اکثر حضراتِ صوفیائے کرام کی خدمت
میں حاضری کا شرف حاصل کیا ہے اور ان سے متمتع ہونے
کے علاوہ کتبِ تصوف کا مطالعہ بھی کیا ہے اور اس کے

؂۱ میرا خیال ہے کہ مومن کے اس شعر کی ایسی شرح اور کسی نے بیان نہیں کی اور یہ یقیناً قابلِ قبول ہے۔

"مقامات" کو سمجھنے کی کوشش کی۔ فنا و بقا کے متعلق صرف علامہ ہجویری[1] علیہ الرحمتہ کا قول نقل کرنا کافی ہوگا: "میری کل ہوا و ہوس کے گم ہو جانے سے میری فنا کی ہوس بھی فنا ہو گئی، (یہ محبت اور حرص بھی کہ مر کر بہشت پاؤں میرے دل سے جاتی رہی)۔ اب جملہ امور میں میری دلی خواہش صرف تیری محبت رہ گئی ہے۔ یعنی جب آدمی اپنے اوصاف بشریت سے فنا ہو جاتا ہے (شہوات و لذات کو ترک کر دیتا ہے)، تو وہ پھر بقا کے معنی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب بندہ اپنی صفتوں کے وجود کی حالت میں صفتوں کی آفتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو وہ اپنی مراد کی فنا کے ساتھ اپنے مقصود کی بقا میں باقی ہو جاتا ہے قرب و بُعد کچھ نہیں رہتا ...."

میرؔ کے متصوفانہ اشعار اور بعض دیگر خصوصیات شاعری پر ایک مختصر رسالہ ترتیب دیا ہے جو انشاء اللہ عنقریب شائع ہوگا اور حاضرِ خدمت کر دوں گا۔

قمری کفِ خاکستر و بُلبل قفس رنگ
اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

کیا ہے؟ استفہام انکاری ہے، یعنی جگر سوختہ کا کوئی نشان نہیں، خاکستر تک باقی نہیں۔ "اے" کلمۂ خطاب ہے میں نے اس کے یہی معنی لیے ہیں نہ کہ "جز"۔ نالہ جگر کو جلا سکتا ہے، جگر کا نشاں کیوں کر بن جائے گا۔ قصور معاف آپ کے بیان کردہ معنی "کیا ہے" کا مفہوم اُجاگر نہیں ہوتا۔ نالہ بے اثر بھی ہے اور جگر کو جلا بھی دیتا ہے۔ اس تضاد پر غور فرمایئے۔

۲۔ آپ کو میرے اشعار پسند آئے ؎

"کلاہ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید"

اب کی چند متصوفانہ اشعار حاضر ہیں۔ بزرگی بعقل است نہ بسال۔ کاش آپ سے "نااہل" اور "نالائق" حضرات، اگر دو ہزار نہیں تو چند ہی پیدا ہو جائیں۔

۳۔ مومن اپنے رنگ میں منفرد ہے۔ اس کی شاعری چند موضوعات میں گھری ہوئی ہے۔ نہ تصوف ہے نہ فلسفہ۔ خالص مجازی عشق کے معاملات و واردات۔ تاہم کلام میں بلاغت ہے تنوع ہے، دلکشی ہے۔ خود غالبؔ اس کا لوہا مانتے تھے اور مشہور ہے کہ اپنا پورا دیوان اس شعر کے معاوضے میں دینے کو تیار تھے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

جتنی خوبصورت فارسی ترکیبیں مومنؔ کے یہاں ہیں اور جس سلیقے سے استعمال ہوئی ہیں، غالبؔ کے یہاں ہرگز نہیں۔ شاید میں پہلا شخص ہوں جس نے کلام مومنؔ کی ایک خصوصیت دریافت کی اور اس کی طرف توجہ دلائی۔ اس طرف میرا دھیان خود اس کے اس مقطع سے گیا ؎

اگرچہ شعر مومنؔ بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہا ہے لیک "معنی بند" و "مضمون یاب" اپنا سا

حسن اتفاق سے آپ کے استفسار سے پیشتر اس کا ایک ایسا شعر مع شرح پچھلے عریضے میں درج کر چکا ہوں۔ نگار کے "مومن نمبر" میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے۔ غالباً ۲۹ء کی بات ہے افسوس کہ وہ مضمون میرے پاس محفوظ نہیں۔ غالب کی شاعرانہ

---

[1] یہ حضرت شیخ علی الہجویری داتا گنج بخش لاہوری علیہ الرحمتہ کی مشہور کتاب "کشف المحجوب" کا اقتباس ہے۔ تصوف کے مسائل کی اس بحث کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کا خیال رہے کہ اس زمانے میں (۱۹۵۳ء) میرا رجحان تصوف کے خلاف تھا اور یہ بعض ایسی کتابیں پڑھنے کا اثر تھا جو تصوف کے خلاف لکھی گئی تھیں لیکن آج (۱۹۶۹ء) میں صوفیائے کرام اور تصوف اسلامی کے بارے میں دوسری ہی رائے رکھتا ہوں۔

عظمت سے نہ مجھے کبھی انکار تھا نہ اب ہے مگر میر کی سی ہمہ گیری،
دل آویزی اور اثر اندازی اُسی کے ساتھ انفرادی تیکھا پن کسی شاعر
میں نہیں۔

غالب کے موازنۂ ظہوری وغیرہ میں جن صاحب کی طرف
اشارہ ہے وہ پروفیسر بیخود موہانی مرحوم ہیں۔ ان کے اقوال ان
کی کتاب "سرمایۂ تحقیق" سے اخذ کئے گئے ہیں"۔ . . . .

نیاز آگیں
آثر

(۶)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء

مکرمی تسلیم

۲۸ ستمبر کا نوازش نامہ مل گیا (آپ ۲۸ نومبر لکھ گئے!)
لا واللہ میں آپ سے ناراض نہیں ہوا نہ آپ کی تحریر کا کوئی
جملہ خلافِ مزاج ہوا۔ البتہ "دیدۂ تر" کی بحث سے اکتا ضرور گیا
تھا۔ ممکن ہے کہ میرے الفاظ نے اس کی غمازی کی ہو، اگر میں آپ
کی رائے کی قدر نہ کرتا ہوتا اور وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھتا
تو آپ سے استدعا نہ کرتا کہ میرا مضمون جو حامیان فراق کے
جواب میں ہے پڑھ کر اپنی رائے سے مطلع فرمایئے تاکہ مجھے مزید
غور کا موقع ملے۔ ابھی فراق کی موافقت میں جو مضمون لکھا گیا
ہے اس کی ایک قسط باقی ہے وہ دیکھ کر اپنا جواب مکمل کرنے
کے بعد حاضر خدمت کر دوں گا۔ کتابوں کے بھیجنے کا عنقریب
انتظام کروں گا، ایک کتاب کا میرے پاس فاضل نسخہ نہیں
ہے، ناشر سے منگا کر بھیجوں گا۔

آپ کے پچھلے خط کا جواب روانہ کر چکا ہوں یقین ہے
کہ مل گیا ہو۔ وعدہ کیجئے کہ آپ آئندہ میرے خط کے
الفاظ سے آزردگی کا پہلو نہ نکالیں گے ورنہ میری
تحریر کی آزادی سلب ہو جائے گی اور ہر جملے پر سوچنا
پڑے گا کہ اس میں آزردگی کا پہلو تو نہیں نکلتا۔ مطالعۂ
غالب کے مقدمے میں جہاں آپ کو اختلاف ہو ضرور تحریر
فرمایئے اور یہ بھی لکھیے کہ اب تک میں نے جو کچھ عرض کیا
اس سے آپ کو اطمینان ہوا کہ نہیں۔ اختلافی امور میں
عبدالشکور[1] صاحب کو حکم بنایئے۔ کیا عبدالشکور صاحب
وہی بزرگ ہیں جو ایک زمانے میں ڈربن کالج (جنوبی افریقہ)
میں پروفیسر تھے اور ان کا ایک مضمون عرصہ ہوا کہ رسالہ زمانہ
کانپور میں شائع ہوا تھا اور مضمون کے آغاز میں میرا یہ شعر
درج کیا تھا ؎

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں
ملگجے پھول ترے بستر کے

اور اس کو حقیقت سے تعبیر کیا تھا۔ اگر میرا قیاس صحیح ہو تو
میری طرف سے آثر نوازی کا شکریہ ادا کر دیجئے۔ اس
کا مطلع بھی بے ساختہ نکل گیا تھا ؎

جان کو روگ ہیں دُنیا بھر کے
ہم تو پچھتائے محبت کر کے

نیاز مند۔ اثر

(۷)

کشمیری محلہ لکھنؤ
۵ راکتوبر ۵۳ء

مکرمی تسلیم

یکم اکتوبر کا گرامی نامہ ملا۔ بہت بہت شکریہ

---

[1] عبدالشکور صاحب مصنف "تنقیدی سرمایہ" "حسرت موہانی" وغیرہ،

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

آپ نے میرے اس شبہ کو رفع نہیں کیا کہ لب "خوشامدی" ہو سکتے ہیں "خوشامد طلب" نہیں ہو سکتے۔ یہ امر تو بدیہی ہے کہ آزردگی سخن لبوں سے ہے۔ مگر یہاں آزردگی سے مراد خفا ہونا نہیں بلکہ اتحادِ عمل قطع ہو جانا ہے سخن لبوں سے ناآشنا ہو گیا ہے۔ باہم مغائرت ہو گئی ہے۔ دوسرے مصرع میں "ہم" سے مراد عاشق ہے اور خوشامد طلب ہونٹ نہیں بت ہیں وہ بھی ایسے خوشامد طلب کہ خموشی کو انتہائے خوشامد سمجھتے ہیں، کیونکہ بت ہیں (لفظ بت کے ایک معنی خاموش کے بھی ہیں) میں نے بہت کوشش کی مگر آپ کا ہم نوا نہ ہو سکا۔ مجبوری ہے۔

ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

آپ کے بیان کردہ مطالب کے متعلق تصوف کے ضمن میں عرض کروں گا۔ یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ معشوق کو لفظ "غافل" سے مخاطب کرتے میں نے کسی شعر میں نہیں دیکھا معشوق کو "غافل"۔ "تغافل شعار"۔ "تغافل پیشہ" وغیرہ کہتے ہیں مگر اس سے خطاب بہ لفظ غافل (مثل ظالم۔ کافر وغیرہ) میری نظر سے کہیں نہیں گزرا، کیا آپ اپنے قول کی سند میں کوئی شعر پیش کر سکتے ہیں جس میں معشوق سے تخاطب لفظ غافل کے ساتھ ہو؟

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

نالہ نے قمری کو جلا کر کفِ خاکستر کر دیا۔ بلبل کو قفسِ رنگ بنا دیا۔ غالبؔ کا جگر جلا دیا پھر بھی غالبؔ نالے کی بے اثری کے شاکی ہیں؟ جگر سوختہ ہو گیا تو پھر نشان چھوڑنا کیسا؟ میری مطبوعہ شرح دوبارہ ملاحظہ فرمایئے۔ جلنے کے بعد صرف کثیف اجزاء باقی رہ جاتے ہیں۔ قمری اور بلبل کا کچھ نہ کچھ نشان باقی رہا۔ جگر ایسا جلا کہ کوئی نشان نہ رہا۔ یعنی غالبؔ کے عشق میں کوئی جزوِ کثیف نہیں تھا۔ آپ کی شرح سے قمری اور بلبل کے عشق پر انسان کے عشق کی افضلیت کا پہلو نہیں نکلتا۔ "کیا ہے" سے "نہیں ہے" مراد لینے سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب اشعار مبہم ہوں گے تو اختلافِ آراء ناگزیر ہے۔

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

...... صاحب کی خدمت میں مجھے بھی نیاز حاصل ہے، گو سرسری۔ اگر شعر کا وہی مطلب ہے جو انھوں نے بیان کیا تو وائے بر غیرتِ عشق جو معشوق کے وصالِ غیر سے راضی و خوشنود ہے۔ یہ امتحانِ عشق کی بے حیائی کا ہوا کہ غیرت کا؟

حضرت بابا فرید گنج بخش یعنی علامہ علی الہجویری علیہ الرحمۃ[1] آپ کے جدِ اعلیٰ تھے مگر قصور معاف تصوف کو یونانی فلسفہ سے قریب تر کہنے سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ نے ان کی نادر روزگار تصنیف "کشف المحجوب" کا مطالعہ نہیں کیا۔ یہ تصوف پر ایسی مستند اور معیاری کتاب ہے کہ اکثر مغربی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو گیا ہے۔ انھوں نے یونانیوں (سوفسطائی) کے فلسفۂ حیات کی سخت مذمت کی ہے اور مردود قرار دیا ہے۔ کشف المحجوب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو شعارِ اسلام کے خلاف ہو۔ کتاب میں فنا و بقا پر سیر حاصل بحث ہے۔ چند اقتباسات

---

[1] حضرت آثر نے دو ناموں کو مخلوط کر دیا ہے۔ شیخ علی الہجویری کا لقب داتا گنج بخش اور حضرت بابا فرید گنج شکر کہلاتے ہیں۔ میں نے غالباً یہ لکھا ہو گا کہ موخر الذکر میرے مورث اعلیٰ تھے،

حاضر ہیں :-

"فنا اور بقا کے علم کا قاعدہ اخلاص اور وحدانیت
پر ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ کفر و زندقہ
ہے۔ جو فنا کو خدا کی ذات میں فنا ہو جانا یا بقا کو
خدا کی ذات سے متحد ہو کر باقی رہنا جانتا ہے وہ
غلطی پر ہے .... حادث قدیم اور قدیم
حادث نہیں ہو سکتا ہماری بقا بھی ہماری صفت
ہے اور ہماری فنا بھی ہماری صفت ہے ....
فنا سے مراد غیر سے ذکر کی فنا ہے اور بقا سے
مراد خدا کے ذکر کی بقا ہے جو اپنی مراد سے
فانی ہے وہ خدا کی مراد سے باقی ہے۔"

جب سرتاجِ انبیا ہمارے رسول کریم صلعم کو منزل تمکین و جمال (معراج) میں بھی "قاب قوسین او ادنیٰ" کا احساس رہا تو اور کسی کا ذکر کیا۔ میں نے انہیں امور کو مدنظر رکھتے ہوئے غالب کے علی الرغم (عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا) کہا :-

بحر سے مل کے بھی رہا ایک حجاب درمیاں
قطرہ فنا تو ہو گیا ترک بدن نہ ہو سکا

یا ہے

قطرہ کھارا بحر میں محو نمود و بود ہے
دیکھئے کیا نتیجہ ہو سرکشی حباب کا

یا ہے

ڈوب کر بحر میں بھی اپنی خودی ترک نہ کر
کہ یوں ہی قطرہ ناچیز گہر ہوتا ہے

یا ہے

آسودۂ فنا نہ ہو جانِ امیدوار
آلودہ پیرہن ابھی گردِ سفر میں ہے

یا ہے

منزل قرب میں پہنچ کر بھی
کچھ سکوت اور کچھ حجاب رہا

ذات مطلق سے کامل اتحاد (سوکش یا نروان) ہندو فلسفہ ہے۔ تصوف سے (اسلامی تصوف سے) اسے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ نظریۂ شہود ہے جس نے تصوف میں تفرقہ ڈالا اور جس کے بانی شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) ہیں جن کا انتقال ۱۰۳۴ھ میں ہوا۔ حضرت علامہ ہجویری کا وصال ۴۵۶ھ یا ۴۶۴ھ میں ہوا۔ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تصوف کے دلق پارسائی میں رخنے پڑتے گئے۔ یہ بحث طویل ہے اور خط میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔

تصوف میں مسئلہ وحدت الوجود کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے والے شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن عربی ہیں۔ یہ اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کا مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ یہ (غالباً غرناطہ کے) ایک امیر کبیر کی لڑکی پر جس کا نام ناظم تھا، عاشق ہو گئے۔ فریفتگی کا یہ عالم تھا کہ جوشِ سرور و مستی میں اس کے حسن کی تعریف میں عشقیہ اشعار برسرِ کوچہ و بازار پڑھتے پھرتے تھے۔ لوگوں نے ملامت کی کہ ایک باعصمت دوشیزہ لڑکی کو بدنام کرتے ہو، انھوں نے فرمایا کہ عشق گناہ نہیں اور عشق کے سوا مجھے اس لڑکی سے کوئی سروکار نہیں۔ لوگ ان کی جان کے درپے ہو گئے اور مجبوراً ترکِ وطن کرنا پڑا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر انھوں نے اپنی مشہورِ عالم کتابیں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ تصنیف کیں تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ڈانٹے کی (DIVINE COMEDY) کے اکثر مقامات فتوحات مکیہ سے مستعار ہیں۔ میں نے ابن العربی کی ایک عشقیہ نظم کا انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ عربی میں خدا جانے کس قیامت کا زور ہو گا۔ ترجمہ آپ کے ملاحظے

کے لئے حاضر ہے ....

نیاز مند: اثر

(۸)

کشمیری محلہ، لکھنؤ

۲۹ نومبر ۱۹۵۳ء

پیارے نثار

۲۶ نومبر کا خط ملا۔ مسرت ہوئی۔ میرؔ اسی قابل ہے کہ اس کا امعانِ نظر سے مطالعہ کیا جائے[1] اور نشاطِ روح و دماغ کا وسیلہ بنایا جائے۔ میں نے اس کا یہ شعر ایک مرتبہ رات بھر گنگنایا ہے۔ تصویر ایک مادی پیکر کی ہے مگر ایک ایسے مادی پیکر کی گویا ایک تابندہ ستارہ مجسم ہو گیا ہے۔ سنو اور اپنے تاثرات بیان کرو ؎

لیتے کروٹ ہل گئے جو کان کے موتی ترے
شرم سے سر در گریباں صبح کے تارے ہوئے

غالبؔ کا یہ شاہ پارہ بھی نہایت قابلِ قدر ہے ؎

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

اس میں سکون ہے، میر کے شعر میں تڑپ ہے[2]

غالبؔ کو اپنے اور میرؔ کے درمیان حدِ فاصل بنا کر ابھی ایک شعر سنانے کو دل چاہتا ہے۔ نہ معلوم پہلے تمہیں لکھ چکا ہوں کہ نہیں ؎

اس کا عالم؟ اس کا عالم! تم نے دیکھا ہے کبھی؟
وہ ستارہ جو "سحر افشاں" سراپا ہو گیا

میر کے بعض اشعار پر اپنے تاثرات قلم بند کر دو، یہی مضمون ہو جائے گا۔ اس پر کتنا ہی لکھتے جاؤ معلوم ہو گا کہ کچھ نہیں لکھا........

تمہارا اثر

(۹)

کشمیری محلہ، لکھنؤ

۱۴ جنوری ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی

۱۲ جنوری کا محبت نامہ ملا۔ میں نے آپ کی اصلاح بطیبِ خاطر قبول کر لی اور مصرع کو بیاض میں درست کر لیا: محبت میں اب یوں بسر ہو رہی ہے۔ بجائے محبت میں یوں بھی بسر ہو رہی ہے۔ بہت بہت شکریہ[3] زندگی ہے تو ۱۵ مارچ کو یا اس کے چند روز بعد دہلی کا قصد کروں گا........ اب میں سمجھا کہ شاعری میں فاقیت سے آپ کی کیا مراد ہے۔ بلا مبالغہ میر کے سیکڑوں اشعار پیش کروں گا۔ فی الحال غالبؔ کا نقل کردہ یہ مطلع لیجئے جو حسنِ اتفاق سے آپ یقیناً سوءِ اتفاق کہیں گے، میر کے ایک مطلع کا دست نگر ہے۔

غالب ؎

---

[1] اس بحث کے بعد ہی میں نے میر کا مطالعہ امعانِ نظر سے کیا اور اب مجھے اعتراف ہے کہ میر کی عظمت کو میں نے اس وقت اچھی طرح نہیں سمجھا تھا۔ میر کے سلسلے میں حضرت اثر کے اور خطوط بھی ہیں جو یہاں غیر متعلق سمجھ کر نظرانداز کر دیئے گئے ہیں۔

[2] دونوں اشعار پر کتنا جامع تبصرہ ہے۔ یہ حضرت اثر ہی کا انداز ہے۔

[3] اس سے حضرت اثر کی عالی ظرفی اور بلند ہمتی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک دلبستان نشین کم سواد کی "اصلاح" کو بطیبِ خاطر قبول کر لیا۔ ان کی محبت اور شفقت نے مجھے اتنا ہی گستاخ کر دیا تھا۔

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میرؔ ؎

ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غالبؔ نے شیخ علی حزیں کے ایک مطلع میں ایک ردیف کو بیکار قرار دیا تھا۔ ان کے مطلع میں خیر سے دونوں ردیفیں بیکار ہیں "دنیا بازیچۂ اطفال ہے۔ روز و شب تماشا ہوتا ہے" مطلب پورا ہی نہیں ہو گیا بلکہ "مرے آگے" کا ٹکڑا اوّل کی آفاقیت میں خارج تھا وہ نکل گیا۔ میرؔ کا مطلع ان تمام اسقام سے پاک ہے۔ غور کرنے کے بعد اپنی رائے سے مطلع کیجیے۔

غالبؔ کا دوسرا شعر ہے ؎

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

شعر کی خوبی میں کوئی شک نہیں۔ میرؔ کا مقطع سنیے ؎

جیب سے ناموسِ جنوں گردن بندھا ہے تب سے میرؔ
جیبِ جاں وابستہ زنجیرِ تا داماں ہوا

غالبؔ کے شعر کا حاصل یہ ہے کہ کشاکش ہائے ہستی سے آزادی ممکن نہیں۔ موج ہاتھ پاؤں مارتی ہے تو زنجیر اور زیادہ اُلجھتی ہے اور وہ زنجیر خود موج کی روانی یا سعی ہے۔ (میرے نزدیک سعیِ آزادی سے جہدِ آزادی کہنا بہتر ہوتا۔ سعی محض کوشش ہے اور جہد کوشش بسیار یا تگ و دو ہے۔ خیر اسے جملہ معترضہ تصور کیجیے) میرؔ کہتا ہے کہ خود جاں وابستہ زنجیر ہے، لہٰذا ہاتھ پاؤں مارنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال میں ناموسِ عشق کی نگہداشت لازم ہے۔ آزادی تو اس وقت تھی کہ "طائرِ جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا" (پورا شعر میرؔ کا یہ ہے) ؎

صد گلستاں تہِ یک بال تھے اس کے جب تک
طائرِ جاں قفسِ تن میں گرفتار نہ تھا

آپ کا نقل کردہ تیسرا شعر غالبؔ کا یہ ہے ؎

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

اس کی شرح "چھان بین" یا تنقیدی مضامین میں کر چکا ہوں۔ میرؔ کا شعر مقابلے میں سنیئے:-

یاں جیسے شمعِ بزم اقامت نہ کر نیاں
ہم "دل کباب" پردے میں سرگرمِ راہ ہیں

وہی بظاہر اقامت مگر در پردہ طے منزل جو غالبؔ کے شعر کا خلاصہ ہے، وہی میرؔ کے شعر کا ہے۔ وہاں تکلف اور تصنع کے ساتھ شکوہ الفاظ ہے، یہاں حقیقت کے ساتھ دست بدست ندرتِ ادا ہے۔ آپ غالبؔ کے اشعار لکھتے جائیے۔ میں جواب میں میرؔ کے اشعار پیش کرتا جاؤں گا۔ فیصلے کا انحصار آپ ہی پر رہے گا۔ انشاء اللہ آپ آفاقیت کے معاملہ میں بھی میری طرح میرؔ کے قائل ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میرؔ کے فاضل اشعار جن میں آفاقیت ہے درج کرکے آپ سے استدعا کروں گا کہ ان کے جواب میں غالبؔ کے اشعار ڈھونڈھیے۔ اقبالؔ اور میرؔ کا کوئی موازنہ نہیں، ایک قومی یا ملی شاعر، ایک غزل گو۔۔۔۔۔۔

آپ کا آثر

(۱۰)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ
۲۰ر جنوری سنہ ۱۹۵۴ء

پیارے بھائی فاروقی

۱۸ر جنوری کا خط کل شام کو ملا۔۔۔۔۔۔

جانِ برادر میرؔ اور غالبؔ کا موازنہ نہیں کسی منزل تک پہنچاتا

نظر نہیں آتا بلکہ ناگوار صورت پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ میر کہتا ہے:

"دیکھا جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا"

آپ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ جب غور سے دیکھا تو وہ تماشا بھی کچھ عجب تماشا ہے۔ حالانکہ جو کچھ غالب نے "بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے" میں کہا میر نے "دنیا عجب تماشا" ہے میں کہہ دیا۔ عجب تماشا میں حیرت ہے، استعجاب ہے تغیرات کے اہم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ بازیچۂ اطفال کہنے سے دنیا محض بچوں کا بے معنی گھروندا ہو کر رہ گئی۔ مرے آگے کے ٹکڑے نے قائل کے علاوہ ہر شخص کو بلا کسی استثناء کے طفل مکتب بنا دیا۔ جو غالب کے سامنے اپنے طفلانہ کرتب دکھا رہا ہے۔ بحث آفاقیت یا عالمگیر حقائق سے شروع ہوئی تھی مگر رفعت و جزالت مضمون آفرینی میں کھو گئی، آپ میر کی سادگی کے بھی قائل ہیں مگر اس کے کلام میں مفکر کا دل نہیں جھلکتا۔ کیا آج تک کوئی ایسا صاحب عظمت بلند مرتبت شاعر ہوا ہے جو مفکر نہ ہو؟ کیا جو شاعر مفکر نہ ہو وہ ایسے شعر کہہ سکتا ہے ۔

مہر فردوس ہو آدم کو الم کا ہے کو
وقف اولاد ہے وہ باغ تو غم کا ہے کو

ہیں مشت خاک لیکن جو کچھ ہیں میر ہم ہیں
مقدور سے زیادہ مقدور ہے ہمارا

ہمت اپنی ہی تھی یہ میر کہ جوں مرغ خیال
اک پر افشانی میں گزرے سر عالم سے بھی

دل نے ہم کو مثال آئینہ
ایک عالم کا روشناس کیا

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پتے کو اس چمن کے نہیں دیکھتے ہیں گرم
جو محرم روش ہیں کچھ اس بدگماں کے لوگ

ہر قطعے پر چمن کے ٹک غور سے نظر کر
بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنا ہے

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں
گرداب کیسا، موج کہاں ہے ہے، حباب کیا

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ہم جانتے تھے تازہ بنائے جہاں کو لیک
یہ منزل خراب ہوئی ہے کبھو کی طرح

یہ دو ہی صورتیں ہیں، یا منعکس ہے عالم
یا عالم آئینہ ہے اس یار خود نما کا

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابل دیدار نہ تھا

صد گلستاں تہ یک بال تھے اس کے جب تک
طائر جاں قفس تن میں گرفتار نہ تھا

غم فراق ہے دنبالہ گرد عیش وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

ہر جزر و مد سے دست و بغل اٹھتے ہیں خروش
کس کا ہے راز بحر میں یارب کہ ہے یہ جوش

اس آفتاب حسن کے ہم داغ شدہ ہیں
اتنے ظہور پر بھی جو منہ کو چھپا رہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو
وگرنہ ہم خدا تھے گر دل بے مدعا ہوتے

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

آئینہ ہو کے صورت معنی سے ہے لبالب
راز نہان حق میں کیا خود نمائیاں ہیں

مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقش پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

اگرچہ نشہ ہوں سب میں خم جہاں میں میرؔ
برنگ بے عرق انفعال اپنا ہوں

لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتیِ رازِ نہاں ہوں

وہم جس کو محیط سمجھا ہے
دیکھئے تو سراب ہے وہ بھی

اور نہ معلوم کیا کیا۔ رواروی میں جو اشعار یاد آئے درج کردیے، کلام غالبؔ کی طرح کلام میرؔ کا بالاستیعاب مُطالعہ کیجئے پھر کوئی رائے قائم کیجئے۔

دہلی آنے کی ایک صورت نکل آئی ہے۔ میں گورنمنٹ آف انڈیا کے Board of Scientific Terminology کا ممبر ہوں۔ اس کا جلسہ ۲۵ اور ۲۶ فروری کو ہونے والا ہے۔ میں کئی جلسوں میں شریک نہیں ہوا۔ اب شریک ہوں گا اور آپ سے ملاقات ہوگی انشاء اللہ،

مصحفیؔ کا ایک قلمی دیوان میرے پاس ہے[۱] اور جہاں تک علم ہے غیر مطبوعہ ہے۔ آپ کے ملاحظہ کے لئے لیتا آؤں گا، رسالہ "تحریک" دہلی میں کچھ دن ہوئے ایک مضمون بھیج چکا ہوں

(۱۱)

کشمیری محلہ۔ لکھنؤ

۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء

پیارے نثار احمد

تمہارا خط باعث وجہ مسرت ہوا ......

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالبؔ نے اپنی رائیگاں بندگی کو نمرود کی خدائی سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح نمرود نے گلزار ارم سجایا مگر اس سے فیض یاب نہ ہوسکا، بلکہ اس کی تعمیر اس کی موت اور محرومی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اسی طرح بندگی اور طاعت اور میرے کام نہ آئی۔ سوالیہ طرزِ کلام نے یہ بلیغ اشارہ کیا کہ شاید میری بندگی میں نمرود کے دعویٰ الوہیت کی طرح غرور، خود پسندی و خود نمائی شامل تھا (وہ نادانستہ سہی) ہے

بہ قدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں ہوں خمیازہ ساحل کا

علی سرہندی کا شعر ہے :-

تو چوں ساقی شوی زردتنگ ظرفی نمی ماند
بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

اس میں خاص بات یہ ہے کہ ساقی کی ایک نگاہ تنگ ظرف کو بھی عالی ظرف بنا دیتی ہے اس کو ایک برجستہ مثال سے ثابت کیا ہے :

بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

غالبؔ کے شعر میں یہ نکتہ نہیں، باقی وہی ہے جو علی سرہندی نے کہا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اے ساقی میں جس طرح پینے میں عالی ظرف تھا کتنی ہی چڑھا جاؤں بدمست نہیں ہوتا تھا، ایسا ہی خوددار ہنگام تشنہ کامی بھی ہوں، شارحین نے "بھی" کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور بہک گئے م

۱؎ میں نے ۱۹۵۳ء میں مصحفیؔ کا کلام ایڈٹ کرنے اور اس کی زندگی و شاعری پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ کتاب کا مسودہ تیار ہے اور اس کا پہلا باب ۱۹۵۸ء میں رسالہ "برہان" دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ کلیات کی ترتیب سے بھی خدا کے فضل و کرم سے فراغت ہوگئی اور اس کے پہلے دو حصے "علمی مجلس" دہلی نے ۱۹۶۸ء میں شائع کر دیے ہیں۔ باقی جلدیں زیر طبع ہیں پورا منصوبہ غالباً ۸ جلدوں میں مکمل ہوگا۔

جب میرے ذوق نے کشتی کی انتہا نہیں تھی اب تمہارا تشنہ کامی کی تھاہ نہیں۔ جس حد کا ذوق نے کشتی تھا اسی حد پہ خمار تشنہ کامی بھی ہے۔ یہ جملہ محذوف چھوڑ دیا ہے کہ اگر یقین نہ ہو تو پلا کے دیکھ لے۔ تیری دریا دلی کے ساتھ ساتھ میری تشنگی بڑھتی جائے گی۔ ساحل دریا کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ مگر خشک، اسی سے ساحل کی تشنہ لبی مسامات شاعری میں سے ہے غور کرو اور لکھو کہ علی سرہندی اور غالب کے شعر میں تمہیں کون زیادہ پرمغز معلوم ہوتا ہے ......

تمہارا۔
اثر

ایک خط

مکرمی ــــــــ

...... ہندوستان کے مشاہیر کے ساتھ اکثر یہ المیہ رہا ہے کہ جب تک ان کو ہندوستان سے باہر کے رہنے والوں نے ان کی عظمت اور برتری کا اعتراف نہ کر لیا ہم ہندوستانیوں نے ان کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا چاہا تم گوتم بدھ سے لیکر چاہا تم گاندھی تک یہ سلسلہ کم و بیش یوں ہی قائم رہا اور اس کے برعکس اگر باہر سے کوئی معمولی دل و دماغ کا آدمی بھی آگیا تو ہم اس کے ورود کے ساتھ ہی اس کی عظمت کے معترف ہو گئے۔ گو شرط یہ ہے کہ وہ باہر کا ہو تار وہ ہے جو آئے لندن سے

مغرب کے لوگوں نے ہماری اس کمزوری سے خوب خوب فائدہ اٹھایا اور اب تک اٹھا رہے ہیں۔ آپ دیکھئے تو ادبیات میں بھی کم و بیش یہی ہوا ہے وہ دیوان غالب اور غالب سے متعلق بہت سا دوسرا مواد یہاں سے لے گئے اور پورے سو سال بعد اُسے یہاں امپورٹ کر دیا۔ ویسے دیوان غالب کا ایک ڈیلکس ایڈیشن اس سے بہت دن پہلے بھی جرمنی میں شائع ہو چکا ہے۔

انھوں نے غالب کی عظمت کا اعتراف کیا تو جیسے ہمیں بھی قومی سطح پہ ہوش آیا اور اس کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر کہیں ڈرامے کہیں بیلے اور کہیں اوپرا کئے گئے اور تماشائے اہلِ کرم دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ جو غالب زندگی بھر قرض کی مے پیتا رہا اس کے نام پر بمبئی میں مفت شراب تقسیم کی گئی۔ آخر کچھ تو حق ادا ہو جائے ــــ!

اب یہ دوسری بات ہے کہ غالب کی صد سالہ یادگار سرکاری سطح اور قومی برتری کے احساس کے ساتھ منانے کے باوجود اُردو زبان سے بے تعلقی اور اس کی حق تلفی کا اب تک وہی عالم ہے جو غالب کے زمانہ میں اس کی اپنی شاعری کا تھا بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ،

آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ

آپ کا ــــ سلیمان، دہلی

۲۶ ۲/۶۹

منصور سعید

شارحینِ غالب

شرح نگاری کی تاریخ کافی پرانی ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اکثر کلاسکس کی شرحیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ لیکن اُردو میں زیادہ شرحیں شعرائے متوسطین کی لکھی گئی ہیں اور تمام شعراء میں سب سے زیادہ غالبؔ کی، جو نہ صرف متوسطین بلکہ تمام اُردو شعراء میں ایک دیوپیکر شخصیت رکھتا ہے۔ غالبؔ کی شرحوں کی افراط کی کئی وجوہات ہیں سب سے پہلی تو یہ کہ غالبؔ ان عام عاشقانہ افکار کا شاعر نہیں ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے لئے عام فہم ہو سکتے ہیں دوسری وجہ غالبؔ کی PERSIANISED اُردو ہے اور تیسری وجہ غالبؔ کی وہ تشکیک اور فکری تجسّس ہے جس سے آشنا ہونے کی توفیق عام نہیں ہے۔ اور سب سے آخری وجہ غالبؔ کا وہ طریقۂ استدلال اور اسلوبِ اظہار ہے جو اُردو شاعری کی روشِ عام سے بہت بلند اور دور رہے۔ غالبؔ جینیس (GENIUS) تھا اور بلا کا جدت پسند۔ اس لئے معمہ بن گیا اور معاصرین کی نگاہ میں معتوب ہوا، بعد میں اس کے کچھ عقیدت مندوں نے جن میں حالیؔ پیش پیش ہیں اسے INTRPRET کرنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ کیفیت رہی ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ کے عالمِ تقریر کا عنقا جہاں پرواز کرتا ہے۔ شارحین کی قوتِ مدرکہ وہاں تک پہونچتے پہونچتے تھک جاتی ہے۔ انسانی فکر کی رفتار ہمیشہ زبان سے تیز تر ہوتی ہے۔ فکر خود اپنے اظہار کے لئے الفاظ ڈھونڈتا اور اسلوب تلاش کرتا ہے اس میں کبھی کامیابی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ غالبؔ کو اپنی فکر کے اظہار کے لئے اُردو کا دامن تنگ نظر آیا اس لئے ان کی قوتِ آخذہ نے فارسی تلمیحات و استعارات سے غیر معمولی طور پر کام لیا۔ غالبؔ اپنے وقت سے بہت آگے کا شاعر تھا۔

غالبؔ کسی ایک دائرۂ فکر کا شاعر نہیں، شارحین غالبؔ کو صوفی یا وحدت الوجود کا قائل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وحدت الوجود کا تصور غالبؔ کا وہ MEDIA ہے جس کے پردے میں غالبؔ اپنے تجسّس اور تشکیک کا اظہار کر سکتا تھا۔ اس مروجہ تصوف کے پیمانہ میں غالب کی اپنی کشید کی ہوئی شراب فکر تھی۔ جسے اس کی تشکیک نے دو آتشہ کر دیا تھا ؎

نشّہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ

اس حقیقت تک پہونچنے اور اسے پہچاننے میں کہیں عقیدت اور کہیں تنگ نظری کے پردے حائل رہے۔ شارحین نے دو خانے بنا لئے۔ وحدت الوجود اور شوخیٔ فکر، اور ہر شعر کو توڑ موڑ کر دونوں میں سے کسی ایک خانے میں ٹھونس دیا۔

غالبؔ اپنی جدت طرازی اور مشکل پسندی کی وجہ سے پوری

پچھلی صدی کے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں ۔ حالی اور اس کے کچھ بعد کے دور میں غالب شناسی اور دیوانِ غالب کی شرح نگاری ادبی فریضہ تھی اور اب فیشن ہوتی جا رہی ہے ۔ اس کا ثبوت وہ لاتعداد شرحیں ہیں جو غالب کے اشعار کی وضاحت اور ان کی فکر کی گرہ کشائی کے لئے لکھی گئی ہیں ۔ اور دیوانِ غالب ہنوز گنجینۂ معنی کا طلسم بنا ہوا ہے ۔ ان شارحین کے خلوص اور علم پر ذرا بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا لیکن میرے خیال میں محض عالم ہونا شعر سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے ۔ الفاظ کی گتھیاں سلجھانا اور قدیم اشعار کی شرح کرنا اور بات ہے اور غالب کے اشعار کے مدعا تک پہونچنا دوسری بات ، کچھ شارحین کے شاعر اور عالم ہونے کا اعتراف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک شعر فہم بھی ہے اسے تسلیم کرنا مشکل ہے ، یقیناً غالب کے کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے معنی تک محض عقل کی مدد سے پہونچا جا سکتا ہے لیکن غالب کے ایسے اشعار بھی بہت کافی تعداد میں ہیں جن تک پہونچنے کے لئے حسیات (SENSES) کی بھی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور ان حسیات کی نشو و نما کے لئے بڑے ریاض اور مجاہدہ کی ضرورت ہے ۔

شرح دو لائنوں میں ترجمہ کر دینے کا نام نہیں ہے ، بلکہ شعر کی کیفیت اور معنی تک پہونچ کر اس کا اظہار ایسے الفاظ میں کرنا کہ ایک کم تربیت یافتہ قاری کے ذہن میں وہ شعر جلوہ گر ہو جائے ، دیوان سامنے رکھ کر (اور خاص طور پر غالب کا) شروع سے آخر تک ہر شعر کی تشریح کر دینا خود کو اور قاری کو سراب دکھانا ہے ، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ شرحیں دسویں ، گیارہویں کلاس کے بچوں کو سمجھانے کے لئے لکھی گئی ہوں لیکن بچوں کو مطمئن کرنے کے لئے ان کو بھٹکانا ضروری نہیں ہے ۔ دو تین شارحین نے اعتراف کیا ہے کہ وہ کسی دوست یا بزرگ کی فرمائش سے مجبور ہو کر شرح نگاری کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ مجھے نہیں معلوم کہ غالب قیامت کے دن دونوں میں سے کس کے گریبان گیر ہوں گے ۔

کچھ شارحین کے ہاں محفلِ وعظ کی سی کیفیت ہے ۔ اور ایک شارح نے تو آخر کار غالب کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ چسپاں کر ہی دیا ۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ شارح کے اس جوشِ عقیدت کا شکار قاری اور حتیٰ کہ خود غالب ہو جاتا ہے ۔ غالب نہ فلسفی تھا اور نہ صوفی بس ایک انسان تھا ۔ اس کی تجسس اور جدت پسند طبیعت نے کسی عقیدے اور مسئلے پر بے سوچے سمجھے یقین کر لینا گوارہ نہیں کیا اور یقین اسے حاصل نہیں ہوا ۔ وہ کسی نئے فلسفے کا بانی اور پرانے اندازِ فکر کا قائل نہیں تھا ، اس میں اچھائی ، برائی ، گناہ ثواب کچھ اس طرح ہم آہنگ تھے کہ اس کے نام کے ساتھ رحمتہ اللہ علیہ یا صوفیت وابستہ کرتے ہی اس کی شخصیت غیر متوازن ہو جاتی ہے ۔ غالب زندگی گذارنے یا کاٹنے کا قائل نہیں تھا وہ "زندگی کرنے" کا قائل تھا اور یہ ہنر اسے خوب آتا تھا بس انہی دو لفظوں میں اس کی شخصیت پوشیدہ ہے ۔ غالب کو سمجھنے کے لئے جس وسیع اور آزاد ذہن کی ضرورت ہے وہ مولویت پسندانہ ذہن اور نیم پختہ شعور کی پہنچ سے بہت دور ہے ۔ حالی سے جوشِ عقیدت میں جو لغزش ہوئی اس سے تقریباً تمام شارحین متاثر ہو گئے ۔ حالی غالب کے مزاج داں نہیں تھے ورنہ غالب کے ان تمام اشعار پر شوخی کا لیبل نہ لگاتے جن سے غالب کی اس کشمکش تشکیک اور ذہنی کرب کے عناصر کا پتہ چلتا ہے جو غالب کو غالب بناتے ہیں ۔ اس عالمگیر غالب شناسی کے موقع پر کبھی شارحین غالب کو پڑھکر یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب ابھی تک سب کی نظروں سے "مخفی ہے"[1] غالب کے رجحان اور اس کی شاعری کو سمجھنے کے لئے انیسویں صدی کا مذہبی و تہذیبی ماحول ، خود غالب کا ذریعۂ آمدنی ، اپنوں بیگانوں

[1] رہ رو تفتہ و در رفت بہ انجم غالب ۔ گوشۂ برلبِ جو ماندہ نستا نستا مرا ، دُنیا میں مجھکو لوگوں نے محض کلام اور قرائن سے پہچانا ہے ورنہ میں جیسا کہ ہوں سب کی نظروں سے مخفی رہا ہوں ۔

سے اس کا تعلق اس کے خطوط، اور اس کے معاصرین کی تحریروں کا جائزہ لینا ہوگا۔ سطحی نظر سے غالب کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ ایک نظر میں غالب میں تیر، بیدل کہیں نظیری اور کہیں عرفی نظر آئیں گے لیکن ہر شعر کے پیچھے جو غالب جھانک رہا ہے اس تک پہنچنا بہت ضروری بھی ہے اور بہت دشوار بھی ہے۔

غالب اقبال کی طرح ایک سیدھی لائن کا شاعر نہیں ہے۔ وہ اپنا ذہنی سفر تشکیک سے شروع کرتا ہے اور بہت سے دائرے بناتا ہوا آگے بڑھتا ہے اور بالآخر اس کا یہ سفر تشکیک پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اقبال کو سمجھنے کے لئے کلاسیکل فارسی، اسلامی تاریخ اور ایک دو جرمن فلسفیوں کا جاننا ضروری ہے جبکہ غالب کے لئے نہ تو یہ سب کچھ ضروری ہے اور نہ کافی۔ اس کے بنائے ہوئے ہر دائرے کی الگ کیفیت ہے۔ ایک ہی وقت میں تمام اشعار کی کی ترتیب وار تشریح کرنا کم از کم غالب کے سلسلے میں ادبی دیانت اور ادبی فہم دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔

غالب کے شارحین کے دو گروہ ہیں ایک گروہ وہ ہے جس نے پورے دیوانِ غالب کی تشریح کی ہے اور دوسرا گروہ ان نسبتاً بہتر لوگوں کا ہے جنھوں نے صرف منتخب اشعار کی تشریح کی ہے۔ خود غالب اپنے خطوط میں کچھ اشعار کی تشریح کی ہے لیکن وہ تشریح بھی تشریح طلب ہے۔ غالب کے پہلے شارح حالی ہیں۔ انھوں نے منتخب اور نسبتاً آسان اشعار کی تشریح کی ہے۔ اور تقریباً تمام شارحین نے حالی سے استفادہ کیا ہے۔ حالی غالب کے عقیدت مند ہیں اور عقیدت مندی ہمیشہ تنقید و تشریح پر اثر انداز ہوتی ہے۔ حالی نے اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کیا کہ غالب کے تجسس اور تشکیک پر شوخی کا پردہ ڈال دیا۔ اس کے پیچھے کوئی بھی شارح نہیں دیکھ سکا کہ کیا ہنگامہ بپا ہے۔

ع

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ان تمام اشعار پر محض شوخی کا گمان حالی کی عقیدت مندی کا فیضان ہی ہو سکتا ہے۔ کچھ اشعار حالی نے براہِ راست غالب سے دریافت کر کے لکھے ہیں اور کچھ اشعار میں انھوں نے نئے پہلو بھی دریافت کئے ہیں۔ لیکن یہ اشعار وہ ہیں جو صرف حسنِ بیان یا صنعت لفظی پر قائم ہیں۔ مثلاً اس شعر کی تشریح ملاحظہ ہوں۔

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں "تیرے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہیں اڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانا کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔ اس تشریح سے پورا شعر ہی غارت ہو گیا ہے دوسرے تمام شارحین نے بھی اس کی یہی معنی لکھے ہیں۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ قسم کیوں کھاتے ہیں۔

غالب کے دوسرے اور اہم ترین شارح جناب طباطبائی ہیں ان کا انداز تشریحی سے زیادہ تنقیدی اور تصحیحی ہے۔ میرا اندازہ ہے

کہ وہ دیوانِ غالب کی شرح کے بجائے غالب کی کرتا ہوں اور غلطیوں
پر مضمون لکھ دیتے تو زیادہ مفید ہوتا کیونکہ وہ ایک ناقد کا ذہن رکھتے
ہیں، شارح کا نہیں۔ جناب شاداں بلگرامی جو طباطبائی کے عقیدت مند
ہیں اور غالب کے شارح بھی۔ انھوں نے پوری شرح میں بہت کم
طباطبائی سے الگ ہو کر کچھ لکھا ہے یا پھر وہ جناب نظم کو DEFEND
کرتے رہے ہیں ان کا انداز بھی تشریحی نہیں ہے تصحیحی ہے۔

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

اس شعر کی تشریح بھی جناب نظم نے اس طرح فرمائی ہے "یہ نقشِ سویدا
خدا نے محض پریشانی سے بنایا تھا یہ داغِ دود آہ سے پیدا ہوا ہے،
جبھی تو اس سے ہمیشہ دھواں اٹھا کرتا ہے"

ہائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ ہی جانا ادھر آپ ہی حیراں ہونا

اس شعر کے سلسلے میں فرماتے ہیں "یعنی ہر مرتبہ سانس لینے میں اس
مبدأ حیات کی طرف دوڑتا ہوں اور اپنی نارسائی سے حیران ہو کر
رہ جاتا ہوں"

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

فرماتے ہیں "اشارہ ہے نمرود حسن کی طرف" وغیرہ وغیرہ

دونوں جہان دیکے سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اس شعر کی شرح جناب شاداں بلگرامی نے یوں فرمائی ہے "ہر طرح
کی خوبیاں عطا کر کے اللہ میاں سمجھے کہ ہم خوش ہو گئے ہم نے اپنے
دل میں کہا کہ تکرار کیا کریں حالانکہ ہم اس سے خوش نہ تھے۔ یہ کچھ نہ
دیتے صرف میرا معشوق مجھے دیدیتے تو البتہ میں خوش ہوتا" ع

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا

اس مصرع میں "قیامت ہے" کے معنی اور استعمال سمجھنے سے معذوری
کا اظہار کیا ہے۔ ع

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

اس مصرع میں "عبادت" کا لفظ ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ جن
اشعار یا الفاظ کے معنی اور استعمال سمجھنے سے جناب نظم طباطبائی
معذور ہیں اس سے کہیں زیادہ مقامات پر شاداں صاحب
معذوری کا اظہار کرتے ہیں۔ دونوں حضرات کی شرح پڑھنے
کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دو مولوی قرآن کی روشنی میں ایک
دوسرے کو لٹریچر ان کی تھیوری سمجھا رہے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ غالب کے اکثر شارحین شاعر ہیں یا مولوی یا
پھر بیک وقت دونوں، جوش ملسیانی اور بیخود کی شرحیں دسویں گیارہویں
کے بچوں کے لئے مفید ہو سکتی ہیں دونوں کا انداز معلمانہ ہے مگر ایم اے
اردو طالب علموں کے لئے، جن کے شعر سمجھنے کا دارومدار صرف شرح
پر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے غالب کے شعر کی کچھ بھی تشریح کر دیجئے وہ
سر دھننے لگیں گے حیرت یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات جو بذاتِ
خود شاعر ہیں شعر سمجھنے کے سلسلے میں مولوی حضرات سے بھی گئے گذرے
ہیں مثلاً ؎

یا میرے زخم رشک کو رسوا نہ کیجئے
یا پردۂ تبسم پنہاں اٹھا دیجئے

کی تشریح میں حضرت جوش ملسیانی یوں رقم طراز ہیں:—
"یا تو یہ کرو کہ رشک کی وجہ سے جو زخم پڑا ہے اسے بڑھا بڑھا
کر رسوا نہ کرو یا رقیب کے ساتھ در پردہ بیٹھ کر مسکرانا چھوڑ
دو۔ یا پھر ؎

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یا رب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

کے بارے میں جناب بیخود دہلوی فرماتے ہیں "رشک دل نے
تیر کی خلش سے سینے کو بچا دیا۔ وہ اس طرح کہ دل نے سینے کے رشک
سے جس میں یار کا تیر چوک کر جا لگا تھا جان دیدی۔ اب تیر یار نے

دیکھا کہ دل عاشق بغیر غم کے مر گیا میری ضرورت باقی نہیں رہی، ترکِ تعلق کر کے نکل گیا "

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار کا

فرماتے ہیں " تو نے آئینہ ایسی حالت میں توڑا جب تو اس میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا گویا تو تماشائی تھا اور میں یہ موقع غنیمت جان کر تجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں ہزار آرزوئیں اور تمنائیں جوش مار رہی تھیں تیرے غرورِ حسن نے یہ گوارا نہ کیا کہ تو اپنا ثانی دیکھتا۔ تو نے وہ آئینہ توڑ ڈالا اور اس کے ٹوٹ جانے سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں "

کچھ اشعار کی تشریح دونوں حضرات نے حالی سے نقل کی ہے کیونکہ دونوں تقریباً ہم عصر شاعر ہیں اس لئے شعر سمجھنے کی صلاحیت بھی برابر ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دہقان چوپال میں عمر خیام کی رباعی کی معنویت اور حسنِ خیال پر روشنی ڈال رہا ہے۔

مولانا آسی اور مولانا سعید بھی غالب کے شارحین کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس بارے میں اندازہ نہیں ہو سکا کہ مولویانِ قوم اور شاعرانِ شہر غالب کی تشریح کی طرف کیوں مائل ہوئے۔

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیٔ جاوید نہیں

اس شعر کی تشریح آسی نے اس طرح کی ہے " اے وہ شخص کہ تجھکو زمانۂ عیش کے زوال کا دھڑکا لگا ہوا ہے۔ اور یہ کھٹکا تجھے کھائے جاتا ہے تو اس سے نہیں ڈرتا اور ان لوگوں کا تجھے خیال نہیں، جو محرومِ جاوید ہیں "

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

مولانا سعید فرماتے ہیں " جب مجھے غش سے افاقہ ہوتی ہے تو میرا معشوق میرے دل میں آ جاتا ہے اور یہ میرے نالے کے اثر سے ہوتا ہے مجھے نہیں معلوم کہ اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں کہ فوراً ہی معشوق کو کھینچ کر دل میں بلا لیا۔

اِک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

فرماتے ہیں " ہمارے دل میں آتشِ عشق کا صرف ایک شرارہ ہے جس سے ہمیں کوئی گھبراہٹ اور پریشانی نہیں ہے۔ اس لئے ہم اس کو " ہوا " یعنی ہیچ کہتے ہیں، یعنی ہمارے حوصلے کے مطابق نہیں شرر ہمارے لئے کم ہے ہم کو تو آگ مطلوب ہے " وغیرہ

دونوں حضرات کا اور خاص طور پر آسی کا انداز واعظانہ ہے نہ معلوم غالب کو ایک دائرے میں محدود کر دینے کی یہ کوشش شعوری ہے یا غیر شعوری لیکن اس رجحان سے غالب کے بہرگیر اندازِ فکر کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ کچھ حضرات مثلاً شاداں بلگرامی وغیرہ نے شرح کسی دوست یا بزرگ کی فرمائش سے مجبور ہو کر لکھی تھی۔ ان دو حضرات کو نہ جانے کس نے مجبور کیا ہو گا۔

آغا محمد باقر اور یوسف سلیم چشتی بھی غالب کے شارحین کے سلسلے کے افراد ہیں۔ یوسف سلیم صاحب نے شرح شروع کرنے سے قبل فلسفۂ وحدت الوجود پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے مجھے کتاب کا یہ حصہ زیادہ بہتر معلوم ہوا۔ ان کی شرح متقدمین سے بہتر ہے کیونکہ انھوں نے تنقید و تصحیح سے ہٹ کر سمجھنے کی کوشش کی ہے حالانکہ ان کا ذہن بھی ایک محدود فضا سے باہر نہیں نکلا، لیکن انھوں نے بہرحال اتنی دھول نہیں اڑائی ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

" مانا کہ میری آنکھیں تجھے دیکھ رہی ہیں مگر محض دیدار سے میرے دلِ ناشاد کی تسلی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ تو ہم آغوشی کا طالب ہے۔ وغیرہ۔

آغا محمد باقر نے اس شعر کی تشریح اس طرح کی ہے:-

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریٔ ہم ہے ہمکو

فرماتے ہیں "دل کو میں اور مجھکو دل گرفتارِ وفا رکھتا ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ ہم دونوں کو کس قدر ذوقِ آزار ہے"

آغا صاحب نے طباطبائی - آسی - سہا - سعید - حالی - بیخود اور حسرت کی شرحوں کو سامنے رکھ کر تمام شارحین کی رائیں نقل کردی ہیں۔ خود کسی نہ کسی سے متفق ہو گئے ہیں اور بس، اگر خود کچھ لکھا ہے تو وہ جس کا نمونہ آپ اوپر دیکھ چکے ہیں -

سہا اور حسرت موہانی کا بھی وہی حال ہے جو باقی شارحین کا ہے

میں عدم میں بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اس شعر کی تشریح میں مولانا صاحب فرماتے ہیں "پہلے میری آہِ آتشیں کا اثر یہ تھا کہ اس سے بالِ عنقا جلتا تھا اور اب تو بالِ عنقا بھی نہیں جلتا گو یا پہلے اتنی تاثیر تھی تو اب وہ بھی نہیں" حسرت کی شرح کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں حالتِ سفر کھسیٹ دی ہے - بہت سارے اشعار نظر انداز کر دیئے ہیں نہ جانے آسان سمجھ کر یا پھر انہیں قابلِ اعتناء نہیں سمجھا،

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

لکھا ہے "فرشتوں کی تحریر پر یعنی کراماً کاتبین کی تحریر پر"

عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا

فرمایا ہے "انھوں نے عمر بھر تو مجھے مرجانے کی راہ دکھائی اب میرے مرجانے پر دیکھئے کیا دکھلاتے ہیں۔

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

" تیر خود ضیقِ مقام سے گھبرا کر نکل گیا - وہ تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا"

یہاں بھی دونوں حضرات کا انداز مولویانہ ہے لیکن مولانا حسرت کے بارے میں مجھے یہ احساس ہوا کہ انھوں نے بہت حد تک اپنے اوپر تشریح کا الزام لیا ہے - ناطق صاحب کا نام بھی شارحینِ غالب میں آتا ہے - اُن کی شرح پڑھکر تو میں غالب کے بارے میں ہی مشکوک ہو گیا -

ایک صاحب مرزا ظفر بیگ نے غالب کے تمام اشعار پر تضمین کی ہیں اور یہ بھی گمان کیا ہے کہ یہ تضمینیں غالب کے اشعار کی تفسیر ہیں نمونہ ملاحظہ ہو -

مدتوں خط و کتابت رہی مرزا سے
تب کہیں قتل کا اقرار کیا قاتل نے
آج کچھ قتل کے سامان بھی مقتل میں ہوئے
تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشہ نہ ہوا

دوسری صف میں وہ شارحین ہیں جنھوں نے منتخب اشعار کی تشریح کی ہے - مثلاً عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے بہت کم اشعار کی تشریح کی ہے اور وہ بھی ان اشعار کی جن میں غالب کے اندازِ فکر سے زیادہ ندرتِ بیان اور صوتی کیفیت کے نمونے ملتے ہیں لیکن ان اشعار کی تشریح سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر سمجھنے کی خوب صلاحیت رکھتے تھے اس کے علاوہ غالب کی غزلوں کا بالکل نئی روشنی میں مطالعہ کیا ہے - لیکن ان کا یہ کام نامکمل رہ گیا ہے - غالب کی غزلوں کی موسیقیت پر ان کے بعد ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا،

نیاز فتحپوری نے غالب کے ایسے اشعار کی تشریح کی ہے - جن میں فارسی الفاظ و تلمیحات کی کثرت ہے - وہ میں الاول سے آگے کوئی بھی تشریح نہیں بڑھ سکی - انداز سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں وہ تو بہ استغفار میں مشغول تھے - وہ اشعار

سے زیادہ الفاظ کی تشریح محسوس ہوتی ہے ۔ پروفیسر ملک محمد عنایت اللہ
نے "الہامات غالب" کے نام سے منتخب اشعار کی تشریح کی ہے،
تشریح کا انداز یہ ہے ۔

لوں وام بختِ خفتہ سے اک خوابِ خوش ولے
غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

لفظ "وام" کے بہت سے معنی ہیں لیکن اس جگہ قیمت یعنی ایک
قسم کے سکے سے مراد ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میرے نصیب تو سوئے
ہوئے ہیں اور میں خود بے خواب جاگ رہا ہوں ۔ دل تو چاہتا ہے
کہ بختِ خفتہ کے دام سے اک میٹھی نیند کا تبادلہ کر دوں لیکن مشکل
یہ ہے کہ میٹھی نیند میری قسمت میں نہیں ہے ۔ اب تبادلہ ہو تو
کیونکر ہو ۔" اس کا مطلب یہ ہوا کہ انھوں نے انتخاب
کے لئے کسی معقول دیوان پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ نہیں کی اور
نہ ہی کسی بڑے سے مشورہ لیا ۔ کچھ شارحین نے "د" کا "و" اور
"و" کا "د" کر دیا ہے اور اضافتوں کا تو ذکر ہی کیا ۔

مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے صرف ان اشعار کی
تشریح کی ہے جو ان کے خیال میں اختلافی مسئلہ بنے ہوئے ہیں
انھوں نے دوسرے شارحین کا حوالہ دیا ہے اور انتہائی عجز و
انکساری سے اپنی شرح پیش کی ہے ۔ شرح کا مطلب صرف یہ
ہے کہ مولانا نادم ۔ نظیری ۔ ظہوری اور غنیمت سے غالب کا مقابلہ
کر کے غالب کی کمتری ثابت کی جائے ۔ ان کی پوری شرح دوسرے
شارحین سے اختلاف کرنے، اسے نبھانے اور فارسی شعراء کے
مقابلے میں غالب کو کمتر ثابت کرنے میں صرف ہو گئی ہے ۔ اور بات کچھ
بھی سمجھ میں نہیں آئی ۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب "افکار غالب" پڑھنے کے بعد
یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب کو سمجھنے کے لئے "وحدت الوجود"
اتنا مانع نہیں آتا جتنی شارح کی کم فہمی حالانکہ خلیفہ عبدالحکیم کا
انداز تفسیری ہے لیکن معلوم ہو جاتا ہے کہ شارح نے شعر کو سمجھا
ہے اور دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے ۔ خلیفہ عبدالحکیم پر
اقبال بے طرح غالب ہے اور جگہ بے جگہ اقبال کے حوالے ملتے
ہیں لیکن پھر بھی میں نے جتنی شرحیں دیکھیں ان میں سب سے
مناسب مجھے "افکار غالب" ہی معلوم ہوئی ۔

آسی نے ان اشعار کی تشریح کی ہے "جو نسخہ حمیدیہ" میں
ہیں لیکن عام دیوان میں موجود نہیں ہیں ۔ غالب داں ہونے
کے شوق نے انہیں اس تشریح پر مجبور کیا ہے ورنہ غالب
کے ان اشعار کی تشریح عام دیوان سے بھی دشوار مرحلہ ہے ۔
دو دو لائنوں کی یہ تشریح غالب کو اور الجھا دیتی ہے ۔

اس کے علاوہ کچھ رسالوں اور کتابوں میں مختلف حضرات
نے غالب کے ایک دو اشعار کی تشریح کی ہے ۔ مثلاً رسالہ
"شب خون" میں شمس الرحمٰن فاروقی نے غالب کے اشعار کی تشریح
کا سلسلہ شروع کیا ہے ۔ حالانکہ یہ تشریح الجبرا کے تھیوری کی
طرح بیان کی گئی ہے لیکن پھر بھی تشریح مناسب ہے ۔ شارح
کی سرد مہری کھٹکتی ہے ۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر تارا چند، شیخ محمد اکرام،
نظام بدایونی، حامد حسن قادری، مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ نے
مختلف کتابوں میں ایک دو اشعار کی تشریح کی ہے ۔ لیکن وہ برائے
بیت ہے ۔

بہر حال غالب کے کسی ایسے شارح کی ہنوز آنکھیں متلاشی
ہیں جو غالب کو اس تنگ نظری ۔ نارسائی اور پابندیوں سے
الگ ہو کر سمجھے اور سمجھاوے ۔ ورنہ پھر غالب کو اس کے حال
پر چھوڑ دیا جائے یہ اس کی ایسی گمراہ کن تشریحات سے بدرجہا
بہتر ہو گا ۔

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

○

رقیہ ناز

غالب

شخصی زندگی کے کچھ پہلو

مرزا غالب مغلیہ تمدن، دلی کی تہذیبی روایات اور ادبی فضیلتوں کا بڑا دلکش اور بے نظیر نمونہ تھے ان کے خطوط اور کلام کا مجموعہ ہماری تاریخِ ادب کا ایک گراں قدر اور بیش بہا سرمایہ ہے ان کا کلام خطوط اور دیگر تحریریں ان کی شخصیت، زندگی اور فکر و ذہن کی بہترین آئینہ دار ہیں بالخصوص ان کے وہ خطوط جو شاگردوں عزیزوں اور دوستوں کے نام ہیں اور جن میں ہر قسم کی معلومات یکجا ہو گئی ہیں ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کی نجی زندگی کے بارے میں جو باتیں جس طرح مان لی گئی ہیں اس طرح ان میں سے اکثر صحیح نہیں ہیں یا پھر ان کا مدار اتنا حقیقت پسندی پر نہیں جتنا عقیدت پر ہے کچھ ایسی باتیں بھی ان خطوط سے معلوم ہوتی ہیں جن سے غالب کی شخصیت کچھ دھندلی یا داغدار نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود غالب غالب ہی رہتے ہیں یعنی اگر غالب کی تمام کمزوریاں صحیح بھی مان لی جائیں تب بھی ان کی ادبی اہمیت وعظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔

مرزا غالب ایک دولتمند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اسی ماحول میں انھوں نے پرورش پائی۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی مشکلات بڑھتی رہیں اور سابقہ آسائشیں معدوم ہوگئیں مگر وہ زمانہ جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور وہ تہذیب جس کی گود میں وہ پروان چڑھے تھے کچھ ایسے گہرے انمٹ نقوش ان کے دل و دماغ پر مرتسم کر گئی تھی کہ ناسازگاری حالات اور وقت کا تیز دھارا بھی ان کے طرزِ حیات کا رُخ نہ موڑ سکا۔ وہ فطرتاً لاابالی تھے اور ثروت کی سیہ مستیوں اور فارغ البالی کی سرمستیوں نے انہیں حد درجہ مسرف اور غیر محتاط بنا دیا تھا جب دولت وثروت کے وسایل ختم ہو گئے تو وہ اپنی روش کو بدلنے کی بجائے اپنے بڑھتے ہوئے مصارف کی تکمیل کے لئے بے تکلف قرض لینے لگے انجام یہ ہوا کہ اسراف ان کی فطرت کا جز و بن گیا شراب کی عادت ایسی پڑی کہ آخر دم تک نہ چھوٹی مزاج رئیسانہ تھا اور شوق بھی، بطور پنشن وہ ساڑھے سات سو روپے سالانہ پاتے تھے اس کے علاوہ مخلص احباب ان کی خدمت کیا کرتے تھے ریاست الور سے بھی کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی تھی جب تک والدہ حیات رہیں وہ بھی وقتاً فوقتاً آگرہ سے امداد کرتی تھیں وہ خود ایک خط میں اس بات کا ذکر کرتے ہیں "روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر، بااین ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا کبھی الور سے کچھ دلوا دیا کبھی ماں نے کچھ آگرہ سے بھیج دیا اب میں ہوں اور ۶۲ روپے آٹھ آنے کلکٹری کے اور سو روپے رام پور کے" [۱] یہ سب آمدنی ملکر سفید پوشی کے لئے کافی تھی لیکن ان آمدنیوں کے ساتھ شاہ خرچیاں تو نہیں چل سکتی تھیں اور جب سارے اخراجات پورے نہ ہوتے مجبور ہو کر

---

[۱] اردوئے معلیٰ ص ۲۵۴ بنام علاؤالدین احمد خان علائی،

انہیں قرض لینا پڑتا اور اس کے ساتھ ہی دوسری مشکلات کو بھی انگیز کرنا پڑتا۔ انھوں نے اپنی زندگی بے جا اخراجات اور چند ایسے شوقوں سے گراں بار کر لی تھی کہ تمام عمر نا آسودگی اور ناہمواری میں گذری۔ چونکہ زندگی رئیسانہ بسر کرنا چاہتے تھے اس لئے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہے۔

مرزا غالب نے اپنے خاندان اور نسلی خصوصیت کے تحت جو ذہن پایا تھا وہ عیش امروز کا قایل تھا وہ فقدان راحت سے گھبراتے تھے اور عیش و آرام کے طلبگار رہتے تھے۔ انہیں صحیح نوابی شان کبھی یسر نہ ہوئی لیکن جہاں تک ہوسکا انھوں نے جاگیرداروں کی تمام وضعداریاں نبھائیں۔ "یادگارِ غالب" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوستوں کا بہت خیال رکھتے اور جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتے ان کے مصائب اور بدحالی سے متاثر ہو جاتے وہ اخلاق و مروت میں عہدِ مغلیہ کے شرفا کا ایک اچھا نمونہ تھے۔ وضعداری اور شائستگی کو بے حد عزیز رکھتے تھے ——— لیکن وہ ایک انسان تھے فرشتہ نہ تھے ان کا دل غصہ، رنج، رشک اور اس طرح کے تمام انسانی جذبات سے بھی بہت جلد متاثر ہوتا تھا بعض جگہ انھوں نے طیش میں آکر اپنے مخالفین کے متعلق ایسے فقرے لکھے ہیں کہ تہذیب انہیں دھرانے کی اجازت نہیں دیتی۔ مولینا حالی لکھتے ہیں کہ اگرچہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی مگر حوصلہ فراخ تھا سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار کے ہو گئی تھی اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے اس لئے اکثر تنگ رہتے تھے[1]

مرزا غالب کے خطوط میں بھی اس بات کا ذکر ہے لیکن عام طور پر یہ مان لینا صحیح نہیں کہ غالب کا سارا قرضہ ان کے حسنِ اخلاق کی وجہ سے تھا مولینا حالی کے علاوہ کسی اور تذکرہ نگار نے ان کی فیاضیوں کا کہیں ذکر نہیں کیا اور بعد میں اگر کیا بھی ہے تو "یادگارِ غالب" کی روشنی میں۔ اس کے علاوہ غریبوں اور محتاجوں کے لئے تنگ رہنا تو وہی گوارا کر سکتا ہے جو ان کی خاطر اپنا آرام اور اپنی ضروریات کو قربان کر دے اور غالب بالعموم اپنے آرام و آسائش کا بہت خیال رکھتے تھے نوکروں چاکروں کے بارے میں بھی ان کا طرزِ عمل ہمیشہ امیرانہ اور رئیسانہ رہا، باہر اندر چار، چار، پانچ پانچ نوکر تھے غدر میں اور اس کے بعد بھی جبکہ مالی پریشانیاں بری طرح دامن گیر تھیں ان کی فراوانی تھی ان کے خطوط میں کلیان، کلو، داروغہ، ایاز، جعفر بیگ اور وفادار وغیرہ کے نام متعدد بار آئے ہیں۔ ان نوکروں کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہانہ سے کچھ اوپر تھی جبکہ ان کی مستقل آمدنی ایک سو ساٹھ سے کچھ زیادہ نہیں تھی۔[2] ایک خط میں نواب یوسف علی خان کو لکھتے ہیں حضور کے عطیہ پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گذارہ ہے عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گذرتی ہے[3] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے ملازموں کی تعداد اچھی تھی اور یہ کہ وہ اس غربت میں بھی لوازماتِ امارت کے پابند اور آرام و آسائش کا بہت خیال رکھتے تھے لباس بھی ان کا نہایت قیمتی اور نفیس ہوتا تھا وہ گھر پر دلی کے شرفا کی طرح بر کا پاجامہ اور کھلی آستین اور الٹی گریبان کا کرتا یا انگرکھا پہنتے تھے سر پر عام طور پر ململ کی گول ہلکی ٹوپی ہوتی جس پر سامانی یا کشیدے کڑھائی کا کام ہوتا تھا جاڑوں میں سردی سے بچنے کے لئے کسی گرم کپڑے کا کلی دار پاجامہ اور مرزئی پہنتے تھے باہر نکلتے تو تنگ مہری کا آڑا پاجامہ کرتا اور اس پر صدری یا جامہ دار کی چپکن اور اس پر نیمہ آستین اور کسی بھاری اور قیمتی کپڑے کی لمبی قبا یا چغہ اور اس پر ایک جامہ، پاؤں میں گھیتلی جوتی یا لوکدار کفشی اور ہاتھ میں موٹھ دار مضبوط لمبی لکڑی بعض اوقات ایک شالی

---

[1] یادگارِ غالب از حالی ص ۵۹، [2] ذکرِ غالب از مالک رام ص ۱۰۷، [3] مکاتیبِ غالب ص ۷۵

رومال بھی کندھوں پر ڈال لیتے ۔ سر پر عموماً کلاہ پاپاخ یا سیاہ پوستین کی چوگوشیہ لمبی ٹوپی کبھی کبھی مغلئی انداز کا پٹکا بھی باندھتے تھے یعنی نیچے مخروطی کلاہ اور اس پر دستار [1] کھانے کے بارے میں بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ خواہ تھوڑا ہو مگر عمدہ ہو، مولینا حالی لکھتے ہیں "مرزا کی نہایت مرغوب غذا گوشت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی صبح کو وہ اکثر شیرۂ بادام پیتے تھے دن کے کھانے میں صرف پاؤ سیر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں لعاب یا شوربا ایک پیالی میں کبھی کبھی ایک انڈے کی زردی اور ایک پیالی میں دو تین پیسہ بھر دہی اور شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب، [2] مولوی حبیب اللہ خاں کے نام کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے آخری ایام میں بھی غالب کا خرچ کم و بیش تین سو روپیہ ماہانہ تھا اور آمدنی صرف ایک سو باسٹھ، لکھتے ہیں "ایک سو باسٹھ روپے کی آمد، تین سو کا خرچ ہر مہینے ایک سو چالیس کا گھاٹا" [3] مزید یہ کہ انہیں جانور پالنے کا بھی شوق تھا باہر ان کی سواری کے لئے گھوڑے تھے اندر بلی، مور، کبوتر، بٹیر، دنبہ، بکری وغیرہ [4] ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مرزا غالب محتاجوں اور مسکینوں کی مدد کی وجہ سے تنگ رہتے تھے جبکہ ان کی اپنی ضروریات شاندار حد تک بڑھی ہوئیں تھیں اگر بقول حالی یہ تسلیم بھی مان لیا جائے کہ وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے تو غدر میں اور اس کے بعد انھوں نے اپنے بھائی مرزا یوسف اور ان کے اطفال و عیال کی کیوں کوئی مدد نہیں کی یہ صحیح ہے کہ مرزا یوسف، غالب سے علیحدہ رہتے تھے مگر کیا غالب پر اپنے چھوٹے اور مجنون بھائی کی مدد کرنا فرض نہیں تھا۔ غدر کی مصیبتیں مرزا یوسف کو تن تنہا جھیلنی پڑیں وہ غریب دیوانہ بھائی کیا مرزا کے کسی اچھے سلوک کا مستحق نہ تھا ایسی حالت میں جبکہ ان کے (مرزا یوسف) بیوی بچے بھی انہیں تنہا چھوڑ گئے تھے، کیا غالب کو مرزا یوسف کی خبرگیری لازم نہ تھی ؟ اور معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ فوت ہوئے تو مرزا غالب نمازِ جنازہ میں بھی شریک نہ تھے [5] ایک اردو خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم تین سال تک انھوں نے اپنی بھتیجی کو ایک پائی تک نہیں بھیجی "حقیقی میرا ایک بھائی دیوانہ مر گیا اس کی بیٹی اس کے چار بچے اس کی ماں یعنی میری بھاوج جے پور میں پڑے ہوئے ہیں اس تین برس میں ایک روپیہ ان کو نہیں بھیجا، بھتیجی کیا کہتی ہوگی کہ میرا بھی کوئی چچا ہے" [6]

یہ صحیح ہے کہ انہیں اس بات کا احساس تھا لیکن عملی طور پر کچھ نہ کر سکے جبکہ ان کا بسر اوقات زیادہ تر چچا کی پنشن پر تھا بےشک وہ اپنی مصیبتوں میں گرفتار تھے لیکن ان کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہی خیال ہوتا ہے کہ ان کا قرضہ غریبوں، مسکینوں کی مدد کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی غیر ضروری حد تک بڑھی ہوئی ضرورتوں کی وجہ سے تھا ان کی ضرورتیں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ وہ کسی کی خاطر اپنے آرام کو قربان نہ کر سکتے تھے۔ انہیں دوسروں کی تکالیف کا احساس تھا اور انہیں دور کرنے کی ان کے دل میں مخلصانہ خواہش کبھی تھی لیکن یہ خواہش اس قدر قوی نہ تھی جس قدر ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی وہ جانتے تھے کہ اخلاق کے معلمین خود نمائی اور فخر کے خلاف چاہے کچھ کہیں لیکن انسان کو اپنی خوبیوں کی طرف اکثر خود توجہ دلانے کی ضرورت ہوتی ہے اور غالب نے کبھی اپنی نظم و نثر کے متعلق انکسار اور کسرِ نفسی

---

[1] ذکرِ غالب ص ۹ - ۱۵۸، [2] یادگارِ غالب ص ۶۵، [3] اردوئے معلیٰ ص ۳۸، [4] ذکرِ غالب ص ۱۷۰،
[5] یادگارِ غالب ص ۳۵ - ۳۶، [6] اردوئے معلیٰ ص ۳۳۵ بنام یوسف مرزا،

سے کام نہیں لیا وہ نام و نمود اور شہرت کے عاشق تھے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام عمر خلعت اور خطاب کے لئے انگریزی حکومت کے در پر جبہ سائی کرتے رہے اور اپنی اس شہرت کے لئے انھوں نے کیا کیا جوڑ توڑ نہیں کئے تقریباً ہر ریذیڈنٹ اور گورنر جنرل کی تعریف میں قصیدے لکھے ہیں اس کے علاوہ گورنر جنرل کے پرائیویٹ سیکریٹری یا کسی عہدہ دار سے ملاقات ہو جاتی تو اس کی مدح سرائی کرنے میں دریغ نہیں کرتے ان کی طبیعت کی حریفانہ حوصلہ مندی ہند کے نوابوں اور بادشاہوں پر مطمئن ہو جانا پسند نہیں کرتی یعنی جب تک ملکۂ وکٹوریہ کے خاص شاعر مقرر نہ ہو جائیں انہیں چین نہیں آسکتا ان میں قناعت طبعاً نہیں تھی وہ ہمیشہ یہی کہتے نظر آئے ؎

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

پھر بھلا ان فرمایہ چشموں سے اس بلانوش کی پیاس کیا بجھ سکتی تھی، وہ چونکہ عیش و عشرت کے دلدادہ تھے بلکہ دنیا طلبی ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی اس لئے ساری عمر اطمینانِ قلب سے محروم رہے اگر وہ عشرت سے گذر کرنے کی فکر میں نہ ہوتے تو یقیناً ان کی پنشن اور فتوح سے ان کی گذر اوقات بفراغت ہو سکتی تھی اور قرضہ کی مصیبت سے بچ سکتے تھے۔ لیکن وہ تو نام و نمود پر اس قدر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ نواب اسد اللہ خاں لکھو یا مرزا اسد اللہ خاں، بہادر کا لفظ دونوں حال میں واجب اور لازم ہے" [1] اور یہی "بہادر" کا لفظ انہیں قرض لینے پر مجبور کرتا ہے۔

پنشن دار کی حیثیت سے غالب اہم شخصیت کے مالک نہ تھے دراصل ان کا حقیقی اعزاز یہ تھا کہ گورنر جنرل کے دربار میں داہنی صف میں دسویں کرسی اور ہفت پارچے مع جیغہ، سرپیچ و مالائے مروارید خلعت پاتے تھے نواب یوسف علی خاں والئ رامپور کو لکھتے ہیں "میں انگریزی سرکار میں علاوہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ چاہتا ہوں گورنمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ و سرپیچ مالائی مروارید خلعت مقرر ہے" [2]

۱۸۴۲ء میں مرزا غالب کو دہلی کالج میں فارسی کی میر مدرسی کا عہدہ پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ انکار کر دیتے ہیں کیونکہ اس سے وضعداری اور خاندانی عز و وقار میں اضافہ کے بجائے کمی آتی ہے [3] ایک طرف تو وہ اس بات کو اپنی خاندانی عزت اور ذاتی وقار کے خلاف سمجھتے ہیں کہ کالج سیکریٹری ان کے استقبال کے لئے باہر نہیں آئے لیکن حصولِ ثروت کے لئے ایسے ہی لوگوں کی خوشامد اور ان کی قربت کی خواہش کو وہ برا نہیں سمجھتے۔ ہندوستانی امراء اور انگریزی حکام کے لئے قصیدے لکھتے ہیں تو اس میں حسنِ طلب کا پہلو کبھی نظر انداز نہیں ہوتا، یہاں تک کہ صلہ آنے میں دیر ہوتی ہے تو وہ بے تاب ہو جاتے ہیں اور تقاضہ سے بھی درگذر نہیں کرتے انھوں نے اپنے قصائد میں خود کو "دریوزہ گر" کہنے سے بھی دریغ نہیں کیا ایسی حالت میں ملازمت کے لئے جاتے وقت سیکریٹری سے جو ادارہ کا نگرانِ اعلیٰ ہے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان کے استقبال کو آئے کس طرح صحیح ہو سکتا ہے اور اس توقع کے پورا نہ ہونے پر خود ملازمت سے انکار کر دینا کتنی عجیب بات ہے جبکہ یہ ملازمت غالب کو ان کے اخراجات کے سلسلہ میں بہت سی پریشانیوں سے نجات دلا سکتی تھی لیکن ان کی نام و نمود کی عاشق طبیعت یہ گوارہ نہ کر سکی۔ مرزا غالب کی زندگی کا

---

[1] اُردوئے معلیٰ ص ۳۴۵ بنام منشی شو نرائن، [2] مکاتیب غالب ص ۲۱-۲۲
[3] یادگارِ غالب ص ۲۶،

واقعہ ان کے فکر و کردار میں عدم توازن کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے اور ان کی بے تکلفانہ قرضداریاں اور ان سے پریشان ہو کر اہلِ جاہ و حشمت کی خدمت میں گذارشیں اسی کی علامت ہیں، حسین علی کی شادی کی بابت نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں "یہ ہیں درِ دولت کا گدائے خاک نشین اور وہ آپ کا غلام تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد جنس اسباب املاک اور میرے گھر میں زیور زرینہ و سیمینہ کا نام و نشان نہیں، حضرت اُدھار قرض کوئی دیتا نہیں آپ روپیہ عنایت فرمائیں تاکہ کام سرانجام پائے اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے"[1] حیرت ہوتی ہے کہ اس وقت انہیں خاندانی عزّ و وقار کا خیال کیوں نہیں آتا جب وہ نواب رامپور کو خیرات کے لئے لکھتے ہیں "ماہِ صیام میں سلاطین و امراء خیرات کرتے ہیں اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے اور اس بوڑھے اور اپاہج فقیر کو روپیہ مل جائے"[2] وضعداری حفظِ مراتب اور رکھ رکھاؤ کی فکر اور شاہانہ عیش سے زندگی بسر کرنے کی کوشش میں بے تکلفانہ قرض لیتے اور پھر آپ نے نجم الدولہ بہادر ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے میں ان سے پوچھ رہا ہوں کہ اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے فلاں صاحب، آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے کچھ تو اکسو۔ کچھ تو بولو، بولے کیا بے حیا بے عزت کوٹھی سے شراب گندھی سے گلاب بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا"[3]

یہ ان کی خوش فہمی ہی تو تھی کہ نواب نجم الدولہ بہادر قوم کے سلجوقی اور افراسیابی کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ ان کی طبیعت کی خود نمائی عیش پسندانہ زندگی کا تصور اور خاندانی فخر و غرور کا جذبہ ہی انہیں قرض لینے پر مجبور کرتا وہ مصائب و آلام کے ہجوم قرضہ اور تنگدستی کو نئے نئے اسلوبوں اور نئے نئے عنوانوں سے بیان کرتے پھر بھی نہیں تھکتے کیا ایک خوددار انسان اپنی پریشانیوں کا چرچا اسی طرح کرتا ہے کہ گویا یہ موضوع ان کے فکر و تخیل پر بطور خاص حاوی تھا، ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں "یہ تمہارا دُعاگو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے یعنی بہت محتاج ہوں سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی جے پور سے مجھکو دو ہزار مل جاتا یہ پانسو تو بھائی تمہاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے سو میرے صرف میں آویں گے مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے وہ بقدرِ رسید سولہ سو کے باقی رہے گا اور وہ جو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے وہ صرف انگریزی سوداگر کے دینے تھے قیمت اس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمہارے مشرب میں حلال ہے سو وہ دیئے گئے"[4]

علاوہ بریں مرزا غالب کی قرضداری میں پنشن کے مقدمہ کو بھی بڑا دخل ہے اس مقدمہ میں بلا مبالغہ ان کا ہزاروں روپیہ اٹھ گیا جس کا بڑا حصّہ انھوں نے مہاجنوں سے سود پر قرض لیا تھا چونکہ انہیں آخری فیصلے کے اپنے حق میں ہونے اور اس کے نتیجہ میں ایک بھاری رقم کے ملنے کا پورا یقین تھا اس لئے انھوں نے کبھی بڑی سے بڑی رقم قرض لینے سے بھی دریغ نہیں کیا اور نہ سود کی شرح کی ہی پرواہ کی، بدقسمتی سے مقدمہ کا فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا قرضخواہوں نے یہ مخالف حالات دیکھ کر تقاضوں سے ناک میں دم کر دیا[5] اور بالآخر ۱۸۳۵ء میں مرزا غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدمہ میں پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہو گئی جوابدہی کے لئے مفتی صدر الدین آزردہ کی عدالت میں طلب ہوئے لیکن جب پیش ہوئے تو یہ شعر پڑھ کر اپنی جان بچالی ؂

---

[1] مکاتیب غالب ص ۹۵، [2] مکاتیب غالب ص ۱۰۰، [3] اُردوئے معلّٰی ص ۳۱۲ بنام قربان علی بیگ، [4] اُردوئے معلّٰی ص ۱۲۱
[5] ذکرِ غالب ص ۵۹،

قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن لہ

جس وقت ان کے خلاف یہ ڈگری ہوئی ہے اس زمانہ میں ان کو مجموعی طور پر چالیس پچاس ہزار روپے قرض دینے تھے کہ اور جب پنشن سے مایوسی ہوئی تو حکومت انگلشیہ کی طرف سے نئے صلے کی توقع پیدا ہو گئی بہر حال مختلف توقعات کی بنا پر وہ قرض لیتے رہے اور اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ سود میں ضائع کرتے رہے ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں "کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو بھائی آج تک ہنڈوی نہیں آئی میں حیران ہوں وجہ حیرانی کی یہ ہے کہ اس ہنڈوی کے بھروسہ پر قرضداروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا آج جون کی پانچویں ہے وہ تقاضہ کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں" سہ ایک اور خط میں خواجہ غلام غوث بیخبر کو لکھتے ہیں "قبلہ کبھی آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ کوئی ہمارا دوست جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے۔ پنشن قدیم اس کا مہینہ سے بند اور یہیں سادہ دل فتوح جدید کا آرزومند" کہ لیکن لوازمات امارت یا فضول خرچی کا یہ عالم رہا کہ جب پنشن کے سلسلہ میں کلکتہ میں قیام کیا تو دس روپے ماہانہ صرف کرائے پر مکان لیا ھہ جبکہ یہ دس روپے اس زمانہ کے لحاظ سے بہت تھے اور خاص طور پر جن حالات میں غالب نے یہ سفر اختیار کیا تھا۔

اس عہد کے روسا چوسر و شطرنج کے ذریعہ وقت گذاری کیا کرتے تھے غالب بھی امارت کے ان لوازمات سے عاری نہ تھے اس لئے یہ بھی کچھ بد کر چوسر کھیلنے کے دلدادہ ہو گئے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۴۷ء میں اس قمار بازی کے سلسلہ میں چھ ماہ کی قید ہو گئی لہ، مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ ان کا مکان باقاعدہ قمار خانہ بن گیا تھا۔ یہ قمار بازی بھی قرضہ کی ادائیگی کے سلسلہ میں تھی وہ خاندانی عزو وقار کی حفاظت کی فکر میں ذلت و رسوائی کے راستہ پر گامزن ہو گئے یہ صحیح ہے کہ وہ اپنے اس فعل پر شرمندہ تھے اور ان کی نظر میں شرافت خاندانی پر دھبہ آ گیا تھا جیسا کہ انھوں نے ایک خط میں ذکر کیا ہے "آپ بدنام ہو گیا ہوں بہت بڑا دھبہ لگ گیا ہے" کہ لیکن غالب دور اندیش نہیں تھے بھلا حالات کو بد سے بدتر کرنا مفت کی جگ ہنسائی اور ذلت و خواری کہاں کی عقلمندی ہے قرضداری نے انہیں تمام عمر جکڑے رکھا وہ سمجھتے تھے کہ ایک متمول اور ذی عزت خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے اخراجات زیادہ ہونے چاہئیں اس لئے ان کی رامپور اور سرکار انگریزی کے ذریعہ ماہوار آمدنی ناکافی ہوتی، آمد تو تھی ایک سو باسٹھ کی اور خرچ تھا تین سو کا تو ایک سو چالیس کا گھاٹا قرض لے کر ہی پورا کیا کرتے اور اس کی ادائیگی کے لئے دوسرے طریقے اپنانے پڑتے کبھی قمار بازی کا سہارا لینا پڑتا اور کبھی نوابوں اور روسا کی خوشامد "حضور قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے بس میرا یہ کام ہے کہ یاد دلا دوں آگے حضرت مالک ہیں" شہ ہر مہینہ انہیں قرض لینا پڑتا لیکن اپنے اخراجات میں کمی نہ کر سکے اور آخر میں تو یہ نوبت آ گئی تھی کہ کوئی قرض بھی نہیں دیتا تھا اپنی پریشانی کا حال نواب کلب علی خاں کو لکھتے ہیں "میرا حال یہ کہ انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے حضور کے عطیہ پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گذارہ ہے عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گذرتی ہے چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا" شہ

ان تمام حالات و واقعات کے پیش نظر شاعرانہ عظمت و برتری کے باوصف اور دودمان تیموری سے متعلق ہونے کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب کم و بیش ان انسانی کمزوریوں کا مجموعہ تھے جن پر اخلاقی حدیں عائد ہوتی ہیں۔ قرض داری زندگی کا ایک پہلو ہے

(باقی ص ۸۵ پر)

لہ آب حیات از محمد حسین آزاد ص ۵۵۴، کہ متفرقات غالب ص ۱۰۰، بنام شیخ ناسخ، سہ اردوئے معلیٰ ص ۱۱۱، کہ اردوئے معلیٰ ص ۲۶۸، ھہ کلیات نثر صفحہ ۹۹ بنام علی بخش رنجور، لہ یادگار غالب ص ۲۷، کہ اردوئے معلیٰ ص ۱۱۳، شہ مکاتیب غالب ص ۱۶۔

رحمت الٰہی ایم اے

غالب کی بذلہ سنجیاں

حالی نے "یادگارِ غالب" لکھ کر جہاں غالب اور غالب کے مداحوں پر سینکڑوں احسانات کئے ہیں وہاں ایک ستم ظریفی یہ بھی کی ہے کہ غالب کی حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور شوخیٔ طبع کے بیشتر واقعات کو لطیفہ لکھ کر بیان کیا ہے۔

غالب نے لطیفے نہیں کہے بلکہ (غلطی سے) ان سے کچھ لطیفے سرزد ہو گئے۔ اب اگر ہم غالب کو لطیفہ گو ٹھہرانے پر ہی تلے بیٹھے ہوں تو اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ کام کرنا چاہیئے کہ غالب کے لطیفوں کو مقبولِ عام کرنے کے لئے ان کے لطیفوں کی شرحیں لکھوا کر جگہ جگہ تقسیم کرائیں اور لوگوں پر یہ دباؤ ڈالیں کہ ان شرحوں کے ذریعے غالب کے لطیفے سمجھنے کی کوشش کریں تاکہ غالب لطیفہ گویوں کی فہرست میں آنے سے نہ رہ جائے۔ یہ خیال میرے ذہن میں اس لئے آیا کہ ایک بار ایک صاحب نے غالب کے لطیفے پڑھ کر مجھ سے دریافت کیا تھا کہ کیا غالب کے لطیفوں کی شرح بھی ملتی ہے ——؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غالب کے لطیفوں کو سمجھنے اور ان سے صحیح طور پر حظ اٹھانے کے لئے بھی خاص قسم کے تربیت یافتہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ صرف زبان کے متعلق تھوڑی بہت سوجھ بوجھ رکھتا ہو بلکہ جسے شاعری کے بارے میں بھی تھوڑی سی واقفیت ہو۔ اسی دوران جبکہ میں غالب کے ہاں لطیفے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا ایک کتاب نظر سے گذری: "غالب کے لطیفے"[1]۔ اس میں غالب کی پتنگ پر کہی ہوئی مثنوی سے لے کر جیل جانے اور موت کی آرزو کرنے تک کے تمام واقعات ہیں۔ بنا بریں بچپن میں غالب نے اگر پتنگ پر مثنوی کہی تھی تو اس میں لطیفے کا کونسا پہلو نکلتا ہے اور موت کی آرزو کی تو اس میں کونسا لطیفہ پوشیدہ ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ غالب نے کئی بار اپنے مرنے کی تاریخ نکالی اور آخر میں جب ایک بار مرنے کی تاریخ کہی تو اس پر انتقال فرما گئے۔ البتہ ان کے ایک شاگرد[2] نے ہمدردی کے طور پر غالب سے کہا تھا کہ یہ تاریخ بھی انشاءاللہ غلط ہوگی۔ اس پر غالب نے کہا تھا کہ اگر یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوا تو سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔

اوپر کی اس تمہید کا مطلب صرف اتنا ہے کہ غالب کے ہاں لطیفے کم اور اعلیٰ درجہ کی شوخ نگاری، ظرافت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے نمونے زیادہ ہیں غالب کے بہت سے لچسپ

---

[1] مرتبہ انتظام اللہ شہابی، حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ [2] منشی جواہر سنگھ جوہر

واقعات، جنھیں آپ چاہیں تو لطیفہ کہہ لیں غالب کی شوخیٔ طبع
بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی مثالیں ہیں اور حاضر جوابی یا بذلہ سنجی
لطیفہ بھی ہو یہ قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اس لطیفے سے فرق
کو ذہن میں رکھ کر اب ہم غالب کے بعض لطائف کا ذکر کریں
گے:-

غالب نے اپنے اندازِ بیان کی شوخی سے کتنے ہی دلوں
کو تسخیر کیا ہو، نہ کیا ہو اصل بات تو یہ ہے کہ غالب خود بھی اپنے
اندازِ بیان کی شوخی کے اسیر تھے اور یہ غالب کے اندازِ بیان
کی شوخی ہی کا نتیجہ تھا جس نے ان کے رازداں کو رقیب اور
نامہ بر کو ان کا حریف بنا دیا اور اسی بیانِ حسنِ طبیعت نے
غالب کو استادِ شہ سے پرخاش مول لینے پر اکسایا۔

غالب اور ذوق کی باہم چشمک کے بارے میں اُردو
کا ہر باذوق تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہے۔ ذوق بادشاہ
کے استاد تھے اور اسی وجہ سے قلعہ میں ان کی شاعری کے
چرچے رہتے تھے۔ غالب بھی اس حقیقت سے واقف تھے
اسی لئے موقع بموقع سخن گسترانہ بات کہنے سے چوکتے نہ
تھے۔ ذیل کے واقعے میں غالب کس خوبصورتی سے استاد
ذوق کو دیوانہ کہہ گئے ہیں۔

ایک مجلس میں غالب اور ذوق دونوں حضرات موجود
تھے۔ غالب نے میر کی تعریف کی اس پر ذوق نے سودا کو میر
پر ترجیح دی۔ غالب نے فوراً ذوق سے مخاطب ہوتے ہوئے
کہا "میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر آپ تو سودائی نکلے"

غالب کی طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔
ان کی ظرافت، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کے لئے وقت اور مصلحت کوئی
چیز نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ غالب نے بسا اوقات ایسے سنجیدہ موقعوں
پر مذاق پیدا کر دیا ہے جہاں پر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں
سے ظرافت کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ ہے ایک
دن شام کے وقت سردار مرزا غالب سے ملنے کے لئے آئے،
ملاقات کے بعد جانے لگے تو غالب خود شمعدان لے کر کھسکتے
ہوئے فرش کے کنارے تک آئے تاکہ روشنی میں دیکھ کر
جوتا پہن لیں۔ سردار مرزا نے انکساری سے کہا "قبلہ آپ نے
کیوں تکلیف فرمائی، میں اپنا جوتا آپ پہن لیتا" غالب نے
کہا "میں آپ کا جوتا دکھانے کو شمعدان نہیں لایا بلکہ اس لئے
لایا ہوں کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن لیں"

غالب کی شوخی اور ظرافت کسی ایک میدان کی تابع نہ تھی،
جب جہاں اور جیسے موقع ملا ہے غالب نے محفل کو زعفران زار
بنا دیا ہے۔ دلی میں رتھ کو بعض لوگ مونث اور بعض لوگ مذکر
بولتے ہیں۔ کسی نے غالب سے پوچھا "حضرت رتھ مونث
ہے یا مذکر-؟" آپ نے کہا "بھیا، جب رتھ میں عورتیں
بیٹھی ہوں تو مونث کہو اور جب مرد بیٹھے تو مذکر سمجھو"

غالب اپنی فطرت کی شوخی سے مجبور تھے اس لئے کبھی
خوش طبعی کا مظاہرہ کئے بغیر نہ رہتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش خاں جو
مرزا کے خسر تھے۔ پیری مریدی کے سلسلے کے ایک بزرگ تھے
اس لئے ہر لحاظ سے آپ غالب کے لئے قبلہ و کعبہ جیسی محترم
شخصیت تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے غالب کو شجرہ نقل کرنے کو
دیا۔ غالب کے لئے ایسا کام جس میں وہ اپنے طور پر بالکل
آزاد نہ ہوں اور ان کی اپنی طبیعت کی اُپج اور صلاحیتوں
کو دخل نہ ہو، بڑا دشوار ہوتا تھا۔ لیکن یہاں حکم کی تعمیل
کرنا بھی ضروری تھا۔ جدت پسند طبیعت اپنی شوخیٔ و ظرافت
سے باز نہ رہی، شجرہ کی نقل اس طرح کی کہ بیچ بیچ میں سے ایک
ایک نام حذف کر گئے۔ شجرہ کی نقل دیکھ کر مرزا الٰہی بخش خاں
بہت ناراض ہوئے اور پوچھا کہ "یہ کیا غضب کیا-؟"
اس پر غالب جواب دیتے ہیں "حضرت آپ اس کا کچھ
خیال نہ فرمائیں۔ شجرہ دراصل خدا تک پہنچنے کا ایک زینہ ہے،"

سوزینہ کی ایک ایک سیڑھی اگر بیچ میں سے نکال دی جائے
تو چنداں حرج واقع نہیں ہوتا۔ آدمی ذرا اچک اچک کے
اوپر چڑھ سکتا ہے۔" نتیجہ کے طور پر غالب کو آئندہ شجرہ نقل
کرنے سے چھٹی مل گئی۔

غالب مذاق میں بھی مقصد کا پہلو نکال لیتے تھے جیسا کہ اوپر
شجرہ نقل کرنے والے واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یا آموں والا وہ
لطیفہ جس کے ردِ عمل کے طور پر بہادر شاہ ظفر کو ایک بہنگی
آموں کی غالب کے گھر بھیجنی پڑی تھی۔

ایک دفعہ غالب بہادر شاہ ظفر کے ساتھ آموں کے باغ
میں ٹہل رہے تھے۔ شاہی دستور کے مطابق یہاں کا آم بادشاہ،
سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہ آتا تھا۔ غالب بار بار آموں
کی طرف دیکھتے اور رہ جاتے آخر بادشاہ نے پوچھ ہی لیا "مرزا
اس قدر غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟" غالب نے فوراً کہا جس کا
مطلب یہ تھا کہ پیر و مرشد وہ جو کسی نے کہا ہے کہ ہر دانے
پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ کسی
دانے پر میرا یا میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا ہے یا نہیں!
صرف اسی مذاق کی بدولت غالب کو یہاں کے آم کھانے کا
شرف حاصل ہوا۔

آموں کے سلسلے میں غالب کا ایک اور دلچسپ لطیفہ
جو زبان زد خاص و عام ہے بڑا پُر لطف ہے۔ غالب کو آم
بے حد پسند تھے۔ غالب کے ایک دوست حکیم رضی الدین خاں
جنھیں آم پسند نہ تھے ایک بار غالب کے ساتھ برآمدے
میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے
گلی سے گذرا۔ آم کے چھلکے پڑے تھے گدھے نے سونگھ کر چھوڑ
دیئے۔ حکیم صاحب کو موقع مل گیا۔ آم کی تذلیل کرنا مقصود
تھا۔ فوراً غالب سے کہا "دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا
بھی نہیں کھاتا" غالب نے کہا "بیشک گدھا آم نہیں کھاتا"

اسی طرح شراب کے سلسلے میں غالب کی بہت سی
ظرافت آمیز باتیں اور بعض لطیفے مشہور ہیں۔ غالب نے
اپنی شراب نوشی پر کہیں بھی پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی،
بلکہ جگہ جگہ صاف طور پر اس کمزوری کا اعتراف کیا ہے یہاں
تک کہ اگر غالب کے پاس شراب کے لئے پیسے نہ ہوتے
تو قرض کی منگا کر پی لیتے تھے۔ کیونکہ شراب کے بغیر رہنا
ان کے بس کی بات نہ تھی۔ "میری مدت سے یہ عادت
تھی کہ رات کو فرنچ کے سوا کچھ کھاتا پیتا نہ تھا اور اگر وہ
مجھ کو نہ ملتی تھی تو رات کو نیند نہ آتی تھی۔"

پنشن بند ہو جانے کے بعد غالب پر ایسا دور بھی گزرا
ہے جبکہ شراب کے بغیر انہیں گذارا کرنا پڑا ہے۔ اس
تنگدستی اور پریشانی کے زمانے میں غالب کو مجبوراً پینے
کا سلسلہ بند کرنا پڑا، شراب کے بغیر غالب پر جو کیفیت
گذری ہو گی اس کا اندازہ میر مہدی کے نام لکھے ہوئے
ایک خط کی عبارت سے ہوتا ہے۔

"میر مہدی! صبح کا وقت ہے۔ جاڑا خوب پڑ رہا،
انگیٹھی سامنے رکھی ہوئی ہے۔ دو حرف لکھتا ہوں، ہاتھ
تاپتا جاتا ہوں۔ آگ میں گرمی سہی، مگر وہ آتشِ سیال کہاں
کہ جب دو جرعے پی لئے فوراً رگ و پے میں گرمی دوڑ
گئی، دل توانا ہو گیا، دماغ روشن ہو گیا۔ نفسِ ناطقہ کو تواجد
بہم پہنچا۔ ساقیٔ کوثر کا بندہ اور تشنہ لب!!! ہائے غضب
ہائے غضب۔"

غالب شراب کے عادی تھے اس لئے شراب کا انتظام
وقت سے پہلے رکھتے تھے۔ دوسرے لوازمات میں سے
غالب سب سے پہلے شراب کو ترجیح دیتے ایک بار غالب
کو پنشن کی چھ ماہی ملی تو آپ سارے روپوں کی شراب
خرید لائے، ان کی بیوی نے جب یہ دیکھا تو پوچھا آپ

سب روپوں کی شراب خرید لائے، اب چھ مہینے تک کھایا کیا
جائے گا — ؟ غالب نے جواب دیا: "رزق دینے کا تو خدا نے
وعدہ کیا ہے شراب دینے کا نہیں۔ اس لئے میں شراب لے آیا ہوں
رزق خداوند تعالیٰ اپنے آپ پہنچائے گا۔"

شراب کے سلسلے میں غالب کا ایک اور لطیفہ ہے۔ نواب
شیفتہ اور غالب کے گہرے مراسم تھے۔ ایک دن شیفتہ غالب کے
ہاں آنکلے۔ جاڑے کا موسم تھا۔ غالب شغلِ مے نوشی میں لگے ہوئے
تھے۔ شیفتہ کو دیکھکر غالب نے شراب کا گلاس ان کے آگے
سرکا دیا۔ شیفتہ غالب کا منہ دیکھنے لگے! غالب چپ ہو گئے
پھر کسی قدر حیرت سے کہا: "حضرت جاڑے میں بھی نہیں
پیتے —"

غالب کہنے کو سنی مسلمان تھے، خدا پر ان کا پختہ ایمان تھا۔ مذہب
کے اصولوں اور فرائض و واجبات کو دل سے تسلیم کرتے تھے،
لیکن غالب سے ان کی تکمیل نہ ہوتی تھی۔ مذہب کے احکام
ظاہری کے تو غالب بہت ہی کم پابند تھے۔ انہیں خود بھی اس
بات کا احساس تھا کہ مجھ میں بہت کم باتیں مسلمانی کی ہیں۔ رمضان
کے روزے رکھنا غالب کے بس کی بات نہ تھی اس لئے اکثر روزے
غائب کر جاتے تھے یہاں تک کہ پورے پورے رمضان کے
روزے کھا جاتے تھے۔ ایک دفعہ بہادر شاہ ظفر نے
غالب سے پوچھا۔

"مرزا تم روزہ کیوں نہیں رکھتے؟" غالب نے کہا۔
"پیر و مرشد جب کھانے کو نہیں ملتا تو روزہ ہی کھا لیتا
ہوں۔" روزوں کے سلسلے میں غالب کا ایک اور لطیفہ ہے
ایک مرتبہ جب رمضان کا مہینہ گذر چکا تو غالب قلعہ میں گئے،
بادشاہ نے پوچھا: "مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟" عرض
کیا: "پیر و مرشد ایک نہیں رکھا۔"

سچ بات کا چھپانا غالب آزادوں کا شیوہ نہ سمجھتے تھے اس
لئے اگر غالب روزے نہ رکھتے تھے تو چھپاتے بھی نہ تھے۔ رمضان
کے مہینے میں ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں: "دھوپ بہت
تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزہ کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی
پانی پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب
فہم رکھتے ہیں میں یوں روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب
فرماتے ہیں روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور
چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔"

روزہ داری کے سلسلے کا ایک اور لطیفہ سنئے:۔
مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر اٹھتے بیٹھتے تھے
وہ مکان کے دروازہ کے چھت پر تھا، اور ان میں ایک
کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں
جھک کر جانا پڑتا تھا اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا۔ اور
مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں ۱۰ بجے سے تین چار بجے تک
وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم
تھا مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کو ملنے کے لئے چلے آئے، اس
وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر
یا شطرنج کھیل رہے تھے مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو
رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھکر کہنے لگے کہ
ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان
مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردد
پیدا ہو گیا۔ مرزا نے کہا کہ قبلہ حدیث بالکل صحیح ہے مگر آپ
کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، یہ
وہی کوٹھری تو ہے۔

غالب کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے تھے۔ البتہ فرمائشوں
کی تکمیل سے بڑا گھبراتے تھے۔ اگر کسی فرمائش سے پہلو بچانا
چاہتے تو اس کا عذر اس طرح پیش کرتے کہ فرمائش کرنے
والا آئندہ اس قسم کی فرمائش نہ کرتا۔ اس ضمن میں ہم مرزا کا ایک

نہایت دلچسپ واقعہ پیش کرتے ہیں۔ مرزا مادۂ تاریخ نکالنے سے بہت گھبراتے تھے اور ایسے موقعوں کو اکثر ٹال جایا کرتے تھے۔ ایک بار نواب علاؤالدین خاں نے جو خود بھی شعر کہتے تھے غالب سے ولادتِ فرزند کی تاریخ اور نام کی فرمائش کی۔ غالب نے اس کے جواب میں لکھا کہ "جب تم خود سخنور ہو تو خود ہی اسمِ تاریخی کیوں نہیں نکال لیتے جو مجھ جیسے بوڑھے ضعیف کو تکلیف دیتے ہو۔" ہو سکتا ہے کہ صرف اس سے ہی غالب کی گلو خلاصی نہ ہوتی آگے لکھتے ہیں "میں نے پہلے لڑکے کا جو اسم تاریخی نظم کر دیا تھا وہ لڑکا نہ جیا اور یہ غالباً میرے نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل بسے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے، جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔ نا صاحب دہائی خدا کی! میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈ وں گا۔"

غزل بر زمینِ غالب

بلال احمد نظرؔ

کوئی بھی اُس کا نا خدا نہ ہوا	جس کو تیرا ہی آسرا نہ ہوا
تم سے وعدہ کوئی وفا نہ ہوا	پھر بھی دل طالبِ دُعا نہ ہوا
پھر گئے تم بدل گئی دُنیا	تم ہوئے مُلتفت تو کیا نہ ہوا
کیا بتائے گا لذتیں غم کی	جو محبت میں مُبتلا نہ ہوا
ہو ہی جاتی دراز شامِ الم	تیری زلفوں کا سِلسِلا نہ ہوا
آہ کیا ہے نہ ہو جو عرش نشیں	وہ نہیں نالہ جو رَسا نہ ہوا
یہ الگ بات تم سمجھ نہ سکے	اشک کب حرفِ مُدعا نہ ہوا

دین پر اُس کی اے نظرؔ ہم سے
سجدۂ شکر تک ادا نہ ہوا

امیر محمد خاں دہلوی

غالب

ایک موسیقار کی نظر میں

شاعری اور موسیقی کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ یہ دونوں انسانی جذبات، احساسات اور نازک خیالات و کیفیات کی ترجمانی کرنے میں دوسرے فنونِ لطیفہ پر فوقیت رکھتی ہیں۔ اور حرف و صوت کے وسیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے کا عکس ہیں۔ موسیقی شعر کی روح ہے اور شعر موسیقی کا پیکر —— خاص طور پر اردو شاعری اور موسیقی کا تو جیسے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اردو شاعری کا پرانا نام "ریختہ" موسیقی ہی کی ایک اصطلاح ہے اس زبان کے سب سے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو خود بھی ایک بڑے موسیقار تھے۔ کئی ساز اور بہت سی راگ راگنیاں ان کی ایجاد ہیں۔

حضرت امیر خسرو کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی، ابوالحسن تانا شاہ اور حضرت خواجہ میر درد جیسے اردو کے بعض عظیم شاعر اور سرپرست موسیقی داں بھی تھے اسی کے ساتھ اردو شاعروں کی غزلیں ارباب حال و قال کی مجالس میں شروع ہی سے گائی بجائی رہی ہیں۔

میرے خیال سے میر تقی میر، خواجہ میر درد، آتش اور داغ وغیرہ کئی شاعر ایسے گزرے ہیں جن کا تمام کلام آسانی سے گایا جاسکتا ہے لیکن غالب ان میں سے نہیں ہیں۔ اس کی وجہ غالب کی مشکل پسندی اور اس کے کلام میں ان اضافتوں کے طویل گچھے ہیں جو الفاظ کی موسیقی اور شعر کے ترنم میں حائل ہوتے ہیں۔

اگر ایک موسیقار کے سامنے کسی شعر یا غزل کو جو اپنے صوتی آہنگ کے اعتبار سے مترنم نہ ہو، اس غرض سے رکھا جائے کہ وہ اسے موسیقی کے سانچے میں ڈھال دے تو وہ ایسا ضرور کر دے گا مگر اس طرح کہ جیسے غالب، بہادر شاہ ظفر کے اشعار کی اصلاح بادلِ نخواستہ کیا کرتے تھے اس میں اسے ایک گونہ دقت پیش آئے گی اور اس پر بھی آہنگ پوری طرح نہ بن سکے گا۔

غالب نے خود کو "مغنیٔ آتش نفس" کہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اشعار میں آتش نوائی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں،

ع

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
دل نہیں جلتا نفس ہر چند آتش بار ہے

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

لیکن شعر خوانی اور غزل سرائی دونوں ایک نہیں ہیں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا ہے کہ غالب کا ہر شعر نازک سے نازک ساز پر گایا جاسکتا ہے۔ مگر اس کی حیثیت ایک عقیدتمندانہ تحسین کی سی ہے۔ واقعہ اور واقعیت سے اس کا تعلق نسبتاً کم ہے۔ اس لئے اگر موسیقی کے ضوابط کے اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو ان کا کلام الف سے لے کر ی تک ایسا نہیں ہے جو غزلیت اور غنائیت یا موسیقی سے پر ہے اور ترنم کے دائرے میں آتا ہو، وہ بحور و اوزان کا پابند ہے لیکن موسیقی کے اپنے اصول و ضوابط ان کے پیش نظر نہیں رہے، ہاں! ان کے اردو کلام کا کچھ حصہ ایسا ضرور ہے جو گایا جاسکتا ہے۔

غالب کے اردو کلام میں کچھ غزلیں ایسی ہیں جو سازوں پر گائی جاسکتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن کو گلے سے ادا کیا جاسکتا ہے اور کچھ ایسی ہیں جن کو ساز اور آواز دونوں پر پیش کیا جاسکتا ہے ؎

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاقِ نسیاں کا

صرف گلے سے گائی جاسکتی ہے، اسی غزل کی ادائیگی کے لئے سازوں کی چنداں ضرورت نہیں، تار کے ساز اور تال کے ساز صرف مغنّی کے گلے کی اداؤں کو موسیقی کے دائرے میں لاسکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ سازندوں اور گلوکاروں کا ایسی غزل میں مقابلہ ہو جائے۔ مقابلے کے لئے یہ دوسری غزل موزوں رہے گی۔

ع

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

اس غزل میں گلوکاروں اور سازندوں کی بہ آسانی "جگل بندی" ہو سکتی ہے۔ ایک طرف ۔ گویا کوئی تان لے گا تو سازندہ اس کی سنگت کرنے کے علاوہ اپنی تان بھی اس میں ملا دے گا کیونکہ اس کی طرز بنانے میں لوچ اور پائیداری ہوگی، سازندے وہیں گویے کو دبوچ لیتے ہیں جہاں وہ کسی سادہ طرز میں اس کو گاتے ہوئے دیکھتے ہیں اس لئے فنکار غزل ایسی طرز میں پیش کرتے ہیں جس کی "سنگت ساتھ" کرنے میں سازندوں کو کٹھنائی ہو۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

سازوں پر بجانے کے لئے بہترین غزلیں ہیں،

کسی چیز کو موسیقی کے دائرے میں لانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ موسیقار اس چیز کا اچھی طرح مطالعہ کرے۔ وہ اگر یہ دیکھتا ہے کہ یہ خوشی و شادمانی کے جذبات کی ترجمان ہے تو اس کے لئے ویسا ہی راگ منتخب کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ دیکھتا ہے کہ اس میں حزن و ملال اور رنج و غم کے جذبات بھرے ہیں تو اس کو پُرسوز و ملال انگیز راگوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نکتہ موسیقار کی موسیقی پر دسترس کی آئینہ داری کرتا ہے۔

غلام محمد "مرزا غالب" فلم کے میوزک ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے اس فلم کی غزلوں کی موسیقی دیتے وقت کچھ ناانصافی کی، "دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے" اور "نکتہ چیں ہے غمِ دل" کی جو طرزیں بنائی گئی ہیں اُن سے غلام محمد کی مہارتِ فن پر روشنی پڑتی ہے لیکن ؎

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

ان کی عجلت پسندی کی نذر ہو گئیں جس سے کہ ان غزلوں کا تاثر اور اثر آفرینی پوری طرح نہ ابھر سکی۔ اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ موسیقار جب تک غزل کا ماحول نہیں سمجھے گا، کامیاب طرز بنا ہی نہیں سکتا، موسیقی میں بہت کچھ بحر اور زمینوں کا کھیل ہے۔ مثلاً میر کی اس بحر کی غزل سے

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

مترنم بحر ہے۔ اور یہ بحر موسیقی میں بڑے لطف سے گائی جاسکتی ہے۔ اس کے برخلاف جب کچھ سنگلاخ بحروں میں طبع آزمائی کی جائے گی (جیسے غالب نے کیا ہے)، تو ان کے لئے بڑی بڑی تالیں درکار ہوں گی۔ جیسے نو ۹ ماترے کی بسنت، گیارہ ۱۱ ماترے کی ایک تالی، تیرہ ۱۳ ماترے کی فرودست، اور چودہ ۱۴ ماترے کی اشٹ منگل یا برہم تال وغیرہ "نکتہ چیں" اور "دلِ ناداں" والی غزلوں کی زمینیں موسیقی کے لئے بہت موزوں ہیں لیکن "تا رِ بستر یک تنی" اور "رجو نہ بابِ نبرد تھا" والی غزلوں کی زمینیں موسیقی کے لئے غیر شگفتہ ہیں۔ میر، داغ، درد، آتش وغیرہ نے اکثر آسان زمینیں چنی ہیں لہٰذا ان کا کلام بآسانی گایا جاسکتا ہے اور اس میں چاشنی کا عنصر برابر قائم رہ سکتا ہے۔ بہ نسبت غالب کے کہ ان کی تمام غزلوں کے لئے یہ صورت ممکن نہیں۔ "دلِ ناداں" والی غزل کا راگ "دیس" ہے۔ یہ راگ ہجر و فراق اور غمگین عنوانوں کے لئے بہت موزوں رہتا ہے۔ "ہے بسکہ" کا راگ "ایمن" ہے۔ یہ راگ بھی ہجر و فراق کے لئے مناسب ہے۔ کیونکہ اس غزل کا ٹھاٹھ، غمگین نہیں تھا بلکہ اس میں ایک بیانیہ انداز تھا جس کو غلام محمد نہ سمجھ سکے اور انھوں نے "ایمن" میں "ہے بسکہ" طرز بنا کر غزل کو ڈبو دیا۔ اس راگ میں بنی ہوئی طرز کتنی اچھی لگتی ہے جو بہادر شاہ ظفر کی ہے

لگتا نہیں ہے دل میرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

کیونکہ ظفر کی اس غزل کا ٹھاٹھ سوز والا تھا۔ اور راگ الم انگیز چنا گیا تو گانے کا لطف دوبالا ہو گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کی بہت سی غزلیں بیشتر راگوں کے لئے نامناسب ہیں انھوں نے بہت سی غزلوں میں قافیہ پیمائی کی۔ موسیقیت، موسیقی یا راگ ہر دیا کا خیال نہ کیا۔

پچھلے بیس پچیس برسوں میں بہت سے گلوکاروں نے غالب کی بہت سی غزلیں گائی ہیں یہ اندازہ کہ کس نے سب سے اچھی گائی ذرا مشکل سا ہے۔

سب سے پہلے نظر کندن لال سہگل پر پڑتی ہے۔ اس شخص کی آواز میں کچھ نہیں تھا۔ اس زمانے کی فلموں میں یہ اس لئے مشہور ہوا کہ جو گویئے تھے وہ کلاسیکی موسیقی زیادہ جانتے تھے (اب بھی یہی بات ہے) فلم کے گانے گانا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ یہ تو اب رواج ہو گیا ہے کہ جسے فلمی گلوکار بننے یا فلم میں کچھ نہیں تو جھلکی مارنے کے ہی سین میں آنے کے خواب دیکھتا ہے۔ ہاں تو بات سہگل کی چل رہی تھی سہگل کی آواز خراب تھی۔ مائیک کے لائق نہیں تھی۔ غالب کی غزلوں کے کچھ ریکارڈ اب بھی اس کی آواز میں بجتے ہیں۔ جس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ تلفظ اور ترنم کی شکل بگڑ گئی ہے اسکی آواز کی جھرجھراہٹ غزل کے پیکر کو لپکپا دیتی ہے (بھگوان معاف کرے)

اسی زمانے کی ثریا بھی ہے۔ اس کی آواز روکھی ہے گلے میں سُر نہیں ہے۔ اگرچہ ثریا نے غالب کی غزلیں بہتر طور پر گانے کی کوشش کی ہے۔ مگر قدرت کے کارخانے میں

کسی کا بس نہیں چلتا۔ موسیقی پر دسترس اور شاعری میں کمال یا کسی اور کام کا ملکہ خداداد ہوتا ہے۔

محمد رفیع نے غالب کی غزلوں کو اپنی قدرتی "پاٹ دار" آواز میں گایا ہے اور کمال کیا ہے رفیع نے ؎

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

جس میں شکل غزل کو اپنی قدرتی پاٹ دار آواز اور روشن اور زور دار آواز میں گا کر اپنا نام چمکایا۔ لیکن پوری غزل سننے کے بعد کوئی تاثر دل پر نہیں بیٹھتا وہ اس لئے کہ غزل ذرا مشکل ہے اب رہی لتا منگیشکر کی بات، اس عورت کو قدرت نے ایک تو سُریلا گلا دیا ہے، دوسرے اس نے موسیقی کو سمجھا اور سیکھا ہے۔ اگرچہ رفیع نے کچھ بھی نہیں سیکھا۔ لتا اپنے سُریلے گلے سے بھونڈی سے بھونڈی طرز کو بھی ایسی عمدگی سے گا دیتی ہے کہ سننے والا پھڑک اٹھتا ہے ؎

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

جیسی غزلوں کو اس طرح گایا ہے کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

غالب، شخصی زندگی کے کچھ پہلو بسلسلہ صفحہ ۴۶

بسلسلہ صفحہ ۴۶

لیکن اس کے اسباب و محرکات پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ ہے اس تن آسان زندگی کا جس کے عادی غالب ہو چکے تھے اوپر کہا جا چکا ہے کہ وہ مے نوشی، قمار بازی، چوسر شطرنج بازی کے بڑے رسیا تھے اس کے علاوہ قرض کے سلسلے میں نہیں عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا، پھر ایک مذموم جرم کی پاداش میں قید بھی ہوئے یہ تمام ایسی باتیں ہیں جو ان کی بنیادی شرافت کی جانب اشارہ نہیں کرتی ہیں ان کا کردار ایک ایسے انسان کا کردار ہے جو مصلحت کوشیوں کو اپنا سب سے بڑا مذہب سمجھتا ہے ان کے قول و فعل میں جو تضاد ہے وہ ایک باغیرت و باہمت انسان کے مزاج و مشرب کے منافی ہے حمیت و ہمدردی کے جذبات سے یقیناً وہ عاری نہ تھے لیکن جیسا کہ واقعات بتاتے ہیں انھوں نے ان کے عملی اظہار کی کبھی کوشش نہیں کی ہے۔ جہاں جہاں انھوں نے ان جذبات کا اظہار کیا ہے اس میں بھی ان کی فطرت کی دوئی کو دخل ہے جو بظاہر کچھ تھی اور باطن کچھ تھی اگر ان کے کلام کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو اس میں بھی یہی بات نظر آئے گی۔

مولانا حالی نے ان کو "حیوانِ ظریف" کہا ان کی یہ ظرافت طنز و طعن کی منزل تک پہنچی ہے جس کا سبب مردم بیزاری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا ان کے کردار کی ان تمام کمزوریوں کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو ہماری نظروں میں ایک عجیب و غریب پیکر آتا ہے اور ہم حیرت کرنے لگتے ہیں کہ کیا یہ وہی غالب ہے جنھوں نے یہ کہا تھا اور کیا ان کو یہ کہنے کا حق تھا ؎

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

۱؎ مکاتیب غالب ص ۵۷،

خلیق احمد اشرفی بی۔اے۔(پاس)، سالِ آخر

خطوطِ غالبؔ کی انفرادیت

۱۸۵۰ء اُردو خطوط نویسی کی تاریخ میں ایک انقلابی سال تھا جب غالبؔ نے فارسی خطوط نویسی ترک کر کے اُردو میں خط لکھنا شروع کئے اور یہ خط نہ صرف اُردو خطوط نویسی کی دُنیا میں بلکہ اُردو نثر کی دُنیا میں بھی ایک نئی تبدیلی، ایک نئے انقلاب کے پیغامبر ثابت ہوئے۔ آسان اور میٹھی بولی لکھنے کی یہ کوشش اُردو ادب کی تاریخ میں کوئی نئی کوشش نہ تھی۔ دلّی ہی کے میرامّن .... اس سے پہلے آسان اور میٹھی بولی میں "باغ و بہار" تصنیف کر چکے تھے ان کی آسان اور میٹھی بولی کو مقفیٰ و مسجع نثر کے شیدائیوں نے بازاری اور گھٹیا کہہ کر رد کر دیا۔ ۱۸۵۰ء میں غالبؔ نے مراسلہ کو مکالمہ بنایا تو ان کے آگے کسی کو لب کشائی کی ہمّت نہ ہوئی اور ان کے زمانے ہی سے ان کی تقلید شروع ہو گئی اب یہ دوسری بات ہے ——

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب

خطوط نویسی میں غالبؔ کی تقلید کی بے شمار کوششیں ہوئیں اور یہ کوششیں کرنے والے مولانا محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ۔ امیر مینائیؔ۔ اکبرؔ الٰہ آبادی اور نیاز فتح پوری جیسے آسمان علم و ادب کے درخشاں ستارے تھے۔ ان کے خطوط میں بھی خطوطِ غالبؔ کی طرح مشکل و طویل القاب و آداب اور مقفیٰ و مسجع عبارت سے پرہیز تھا، سہل و آسان زبان تھی، ادبی رنگ بھی تھا غرض سبھی کچھ تھا مگر کچھ کمی ضرور تھی کہ خطوطِ غالبؔ کا انداز انہیں نصیب نہ ہو سکا اور یہ کمی تھی شوخی، شگفتگی اور طنز و مزاح کی، غالبؔ اپنے شاگرد حالیؔ کی زبان میں "حیوانِ ظریف" تھے، شوخی۔ ظرافت و شگفتگیٔ طبع ان عناصر میں شامل تھے جن کی ترتیب سے ان کے وجود کی تکمیل ہوئی تھی۔ ان کی شخصیت کا یہی وہ وصف تھا جو ان کے خطوط میں پوری شان سے جلوہ گر نظر آتا ہے اور یہی وہ شے ہے جس کی تقلید سے مقلدین قاصر ہیں کیونکہ یہ مشق کا حاصل نہیں، خداداد شے ہے، حالیؔ لکھتے ہیں :-

"وہ چیز جس نے ان کے مکاتبات کو ناول اور ڈراما سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے وہ شوخیٔ تحریر ہے جو اکتساب، یا مشق و مہارت یا پیروئ تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں :- "مرزا کی تحریر میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر بھرے ہوتے ہیں"۔

غالبؔ کی افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ وہ ہر بات میں شوخی و ظرافت کا پہلو نکال لیتے تھے اسی لئے ان کی شوخی میں یکسانیت نہیں ہے بلکہ یہ ہر جگہ نئے روپ اور نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ کہیں محض الفاظ سے شوخی پیدا کی گئی ہے تو کہیں ایک

معمولی اور عام سی بات کو ایک نئے ڈھنگ ایک اچھوتے پیرائے میں پیش کر کے مزاح پیدا کیا ہے کہیں اپنی غربت افلاس اور کم مائگی اور تہی دامنی کا ہلکے پھلکے انداز میں مذاق اڑایا ہے تو کہیں اپنی بیماری اور شدید تکلیف کے تلخ تذکرہ کو مزاح کی چاشنی دی ہے۔ کسی پر اظہارِ غضب ہے تو وہ بھی ایسا کہ جس پر غصہ کیا ہے وہ بجائے ناراض ہونے کے ان کے ظرافت آمیز اظہار غضب سے لطف اندوز ہو۔ شکوہ و شکایت میں بھی وہی شوخی شگفتگی جاوہ گر ہے جو ان کی شخصیت کا جزو بن چکی تھی۔ عیادت حتیٰ کہ تعزیتی خطوط میں بھی وہ اپنی اس فطری شوخی سے باز نہیں رہ سکے ہیں۔ در اصل ان کے خطوط میں اسی شوخی نے وہ شوخ رنگ بھرے ہیں کہ "اردوئے معلیٰ" اور "عود ہندی" ایسی دلکش و دل فریب تصاویر کے البم بن گئے ہیں جنھیں بار بار دیکھ کر بھی ایک بار اور دیکھنے کی ہوس دل میں باقی رہتی ہے۔

ان کی شوخی۔ ظرافت اور شگفتگیٔ طبع ان کے خطوط میں اس طرح جلوہ گر نظر آتی ہے کہ قاری کے ذہن میں ان کے خطوط کے مطالعہ ہی سے ان کی شخصیت کا ایک نقش ابھر آتا ہے بڑا رنگین اور شوخ سا نقش، حالی نے کیسی سچی بات لکھی ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ مرزا خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔"

ایسے خطوط جن میں شوخی ظرافت اور ہلکے پھلکے مزاح کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں عموماً بے تکلف دوستوں اور بہت قریبی عزیزوں اور شاگردوں جیسے منشی داد خاں الخاطب بہ سیف الحق المتخلص بہ سیاح، مرزا حاتم علی مہر، علاء الدین احمد خاں علائی، شہاب الدین خاں، یوسف مرزا میر مہدی مجروح اور ہرگوپال تفتہ وغیرہ کے نام ہیں۔

غالب نے اپنے عزیز ترین شاگرد مجروح کے نام خطوط میں غالباً سب سے زیادہ اپنی شوخی و شگفتگیٔ طبع اور ظرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔ دہلی میں وبا پھیلی۔ میر مہدی نے وبا کا حال پوچھا۔ جواب میں لکھتے ہیں :-

"........ وبا تھی کہاں جو میں لکھوں کہ اب کم ہے یا زیادہ' ایک چھیاسٹھ برس کا مرد، ایک چوسٹھ برس کی عورت، ان دونوں میں سے ایک بھی مرتا تو ہم جانتے کہ وبا آئی تھی۔ تف بریں وبا....."

میر مہدی نے ایک بار لکھا کہ میرے نام آپ کا خط میرے ہم نام کو مل گیا۔ جواب ملاحظہ ہو :-

"...... صاحب تصور تمہارا ہے، کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھکو دیکھو میں کب سے دلّی میں رہتا ہوں مگر نہ کوئی اپنا ہم نام ہونے دیا نہ کوئی اپنا ہم عرف بننے دیا نہ اپنا ہم تخلص بہم پہنچایا......"

غالب رام پور سے دہلی واپس آئے تو مجروح نے جلد واپس آنے کی وجہ پوچھی۔ جواب کی شوخی ملاحظہ ہو :-

"میر مہدی تم میرے عادات بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے میں اس مہینے رام پور میں کیوں رہتا .... کبھی جی جی میں آتی ہے تو وقت سوم مہتاب باغ میں جاکر روزہ کھولتا ہوں اور سرد پانی پیتا ہوں......"

میر مہدی کے نام غالباً سب سے شوخی بھرا خط وہ ہے جس میں غالب نے اپنے اور میرن صاحب کے درمیان ایک مکالمہ دکھایا ہے۔ میرن صاحب مرزا صاحب کے پاس آئے۔ جو باتیں ان کے درمیان ہوئیں ان کا ذکر میر مہدی کے نام خط میں اس طرح کرتے ہیں کہ "مراسلہ" "مکالمہ" بن جاتا ہے ملاحظہ ہو :-

"اے جناب میرن صاحب السّلام علیکم، حضرت، آداب۔ کہو صاحب آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ؛ حضور میں کیا منع کرتا ہوں......"

علاءالدین احمد خاں علائی مرزا کے قریبی عزیز بھی تھے اور شاگرد بھی۔ اسی لحاظ سے ان کے نام خطوط میں بھی بڑی شوخی و بےتکلفی کا مظاہرہ کیا ہے۔ رجب کا مہینہ ختم ہو کر شعبان کی چھ تاریخ ہو گئی لیکن علائی کا خط نہیں آیا۔ شوخی و ندرت ملاحظہ ہو۔

"لو صاحب وہ مرزا رجب بیگ مرے ان کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے آج ان کی چھٹی ہو گئی آپ شریک نہ ہوتے۔"

علائی کو جب شعر و شاعری کا شوق ہوا تو غالب نے ان کے لئے نیسی تخلص تجویز کیا۔ انھوں نے بعد میں اعتراض کیا کہ نیسی کی تصحیف نشی ہو سکتی ہے۔ جواباً مرزا نے بہت سے تخلص اور ان کی تصحیف دے کر ان کے اعتراض کو بے بنیاد قرار دیا۔ چند جملے ملاحظہ ہوں:۔

"...... رہرو ایک اچھا تخلص ہے رہزو اس کی تجنیس موجود ہے شیون ایک اچھا تخلص ہے ستون اس کی تصحیف ہے...... میرے نزدیک سب سے بہتر تمہارے واسطے خاص فخری تخلص بہتر ہے کہو گے کہ آزاد کے باغ میں ایک آم کا نام فخری ہے......"

علائی ہی کے نام ایک اور خط میں شوخئ تحریر دیکھئے:۔

"خفقان اور مراق اگرچہ تمہارا خانہ زاد موروثی ہے لیکن آج تک تمہاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا۔ اب کیوں آیا۔ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھہرنے نہ دو۔ ہانک دو خبردار اس کو اپنے پاس نہ رہنے دینا۔"

علائی نے غالباً اپنے ایک خط میں نیر رخشاں کو جانشین قرار دینے پر اظہار ناراضگی کیا اور اپنے نومولود بچے کی تاریخ پیدائش اور اس کا اسم تاریخی نظم کرنے کی فرمائش کی تو مرزا نے لکھا کہ "مولانا نیسی علائی کیوں خفا ہوتے ہو ہمیشہ سے اسلاف اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں، اگر نیر خلیفہ اول ہے تو تم خلیفہ ثانی، اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے۔ جانشین دونوں مگر ایک اول اور ایک ثانی"۔ آگے چل کر "ولادت فرزند کی تاریخ" کہنے اور "اسم تاریخی" نکالنے سے اس لئے انکار کرتے ہیں کیونکہ ان کے "نحوست طالع کی تاثیر سے" ان کا ممدوح جیتا نہیں"۔ ثبوت یہ ہے کہ "نصیرالدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدہ میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہنچا ــــــ"

علائی کے نام ایک خط میں استاد میر جان کو بندگی و سلام کا نیا اور اچھوتا انداز ملاحظہ فرمائیے :۔

"استاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی ان کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں دعا، اور اس رو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کمی بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام، اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی، اور اس نظر سے کہ یہ سید ہیں درود اور موافق مضمون اس مصرعہ کے ـ ــ یہ اللہ واللہ مانی الوجود تجود"

منشی ہرگوپال تفتہ بھی غالب کے بہت چہیتے اور بےتکلف شاگرد تھے اور اسی لئے ان کے نام خطوط میں بھی جابجا شوخی اور بےتکلفی کے بڑے حسین مظاہرے ملتے ہیں۔ تفتہ نے ایک بار لکھا کہ آپ نے میرے اشعار کی اصلاح بسبب ذوق شعر منظور کی ہے۔ جواباً شوخی و بےتکلفی ملاحظہ ہو :۔

"لاحول ولا قوۃ کس ملعون نے بسبب ذوق شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بطریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا جیسے جورو بڈھے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہی معاملہ ہے۔"

بعض خطوط میں ہلکا پھلکا مزاح اور لطیفے ہیں۔ یوسف مرزا کے نام ایک خط میں حافظ محمد بخش عرف حافظ مموں کا لطیفہ سناتے ہیں :-

"حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون۔ عرض کیا کہ میں، پھر پوچھا کہ حافظ مموں کون، عرض کیا کہ میں ...... فرمایا حافظ محمد بخش بھی تم حافظ مموں بھی تم۔ سارا جہاں بھی تم۔ جو دنیا میں ہے وہ بھی تم، ہم مکان کس کو دیں ..... ؟"

مرزا نے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تاریخوں میں خط لکھا تھا۔ تفتہ نے اس کا جواب غالباً جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری تاریخ کو بھیجا۔ اس کے جواب میں دیکھئے کیسا لطیفہ پیدا کرتے ہیں :-

"دیکھو صاحب۔ یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو اور مزہ یہ ہے کہ جب جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہوگے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا تھا اور لطف اس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے "

منشی نبی بخش حقیر کے نام ایک خط میں اپنی روزہ داری کا ثبوت یوں دیتے ہیں۔ مزاح اور شوخی قابل داد ہے :-

"...... دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم رکھتے ہیں میں تو روزہ بہلاتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے ..... "

اسی طرح کالپی کے نواب انوار الدولہ سعد الدین خاں شفق کو اس "حرف شناس فلاں ناتھ یا مٹھن داس" بنیئے کا لطیفہ نشاط انگیز" سناتے ہیں جو بلی ماروں میں ڈاک کا ہرکارہ رہے اور

جس نے "مخدوم نیاز کیشاں" پڑھ کر اسے "کپتان" سمجھ کر مرزا کو کالپی سے کپتانی کا خطاب ملنے پر مبارکباد پیش کی تھی۔

خطوط میں جابجا بے تکلفانہ انداز تخاطب بھی جس میں شوخی اور مزاح کا ہلکا سا رنگ شامل ہے، ان کی شوخی و شگفتگی طبع کو ظاہر کرتا ہے۔ ایسا تخاطب عموماً مجروح۔ تفتہ۔ علائی۔ یوسف مرزا وغیرہ کے نام خطوط میں ملتا ہے، مجروح کو ایک خط میں اس طرح مخاطب کرتے ہیں :" مار ڈالا یار تیری جواب طلبی نے ..... "

انہیں کے نام دوسرے خط میں تخاطب کی بے ساختگی ملاحظہ ہو :-

"کیوں یار کیا کہتے ہو۔ ہم بھی کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں ؟ ... "

ایک اور جگہ میر مہدی مجروح کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں۔

"میری جان خدا تم کو ایک سو بیس برس کی عمر دے۔ بوڑھا ہونے آیا۔ داڑھی میں بال سفید آگئے مگر بات سمجھنی نہ آئی۔ "

تفتہ کے نام ایک خط اس طرح شروع کرتے ہیں :" میری جان آخر لڑکے ہو بات کو نہ سمجھے ..... "

یوسف مرزا کے نام ایک خط میں انداز تخاطب ملاحظہ ہو۔

"کوئی ہے۔ ذرا یوسف مرزا کو بلائیو۔ لو صاحب ! وہ آئے، میاں میں نے خط تم کو بھیجا ہے مگر تمہارے ایک سوال کا جواب رہ گیا ہے اب سن لو ..... "

علائی کو ایک خط میں اس طرح مخاطب کرتے ہیں :" میری جان۔ کیا کہتے ہو ؟ کیا چاہتے ہو ؟"

علائی ہی کے نام ایک اور خط میں انداز تخاطب کی بے تکلفی اور قافیہ پیمائی ملاحظہ ہو :-

"یار بھتیجے گویا بھائی، مولانا علائی، خدائی دہائی ..... "

غالب نے کہیں کہیں الفاظ سے بھی مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ نواب امیر الدین خاں کو ان کے بچپن میں ان کے ایک رقعہ کے جواب جس میں انھوں نے مرزا صاحب کو

دادا لکھا تھا۔ اس طرح لکھتے ہیں :۔

"....... میاں تمہارے دادا نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں ....."

مولوی عزیز الدین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"صاحب کیسی صاحب زادوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ دلی کو ویسا ہی آباد جانتے ہو جیسا آگے تھی۔ ....."

ایک شاگرد میاں داد خاں سیاح جو سیر و سیاحت کے شوقین اور سورت کے رہنے والے تھے، جب ایک بار سیاحت کے بعد گھر واپس پہنچے اور مرزا کو اطلاع دی تو جواباً لکھا "سورت کا پہنچنا بہر صورت مبارک ہو ....."

ایک دوست قاضی عبدالجمیل صاحب جنون کے نام ایک خط میں الفاظ سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش ملاحظہ ہو :۔

"فارسی کیا لکھوں، یہاں ترکی تمام ہے ....." انہیں کے نام ایک دوسرے خط میں یہی خوبی ملاحظہ ہو۔ ان کی غزل جو انھوں نے غالباً بغرض اصلاح بھیجی تھی کھو گئی ہے۔ اس کی اطلاع مرزا ان کو اس طرح دیتے ہیں :" وہ غزل جو کہار لایا تھا وہاں پہنچی جہاں اب میں جانے والا ہوں یعنی عدم ....."

کچھ خطوط میں ایک عام اور معمولی سی بات کو ایک نئے انداز اور ایک نئے ڈھنگ سے لکھ کر ندرت طبع اور شوخی کا مظاہرہ کیا ہے۔ علائی کے نام ایک خط میں بیوی کو بیڑی، دلی کو اپنا قید خانہ اور دونوں بچوں حسین علی اور باقر علی کو دو ہتکڑیاں کہہ کر استعاراتی زبان میں اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں :۔

"....... سنو عالم دو ہیں۔ ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم دونوں عالموں کا وہ ایک ہے .... ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گنہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ...."

اسی طرح تفتہ نے غالباً ایک خط میں یہ لکھا کہ اگر میں اپنے اشعار بغرض اصلاح بھیجوں تو آپ ان سے گھبرائیں گے تو نہیں جواب میں تفتہ کے اشعار کو معنوی پوتے قرار دیا ہے۔ چند جملے ملاحظہ ہوں :" جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے .... کہیں پانی لنڈھاتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں، میں نہیں تنگ آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں کیوں گھبراؤں گا؟"

غالب شکوہ و شکایت اور کسی پہ اظہار غضب میں بھی یہ امر ملحوظ خاطر رکھتے تھے کہ وہ ناراض نہ ہو اور کوئی بات اس کے ناگوار خاطر نہ ہو۔ ان کا یہ دعویٰ بالکل درست تھا کہ شکوہ کے فن کو ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ ان کا اظہار غضب اور شکوہ و شکایت مکتوب الیہ کے لئے ناگوار طبع بننے کے بجائے سامان لطف تبسم بن جاتا ہے۔ تفتہ کے نام ایک خط میں ان کے خط نہ لکھنے کی شکایت اس طرح کرتے ہیں :۔

"کیوں صاحب یہ کیا آئین جاری ہوا ہے کہ سکندرآباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندرآباد یہاں کی ڈاک میں نہ جائے۔"

اب ذرا اظہار غضب، ناراضگی میں بھی شوخی و ظرافت کا رنگ ملاحظہ ہو۔ میر مہدی نے اپنی ایک کتاب "مصطلحات الشعراء" کا، جو غالب نے غالباً ان سے اپنے مطالعہ کے لئے مستعار لے رکھی ہے تقاضہ کیا ہے۔ جواباً ان پر اس طرح اظہار غضب کرتے ہیں :۔

"....... کتنے اوچھے ہو، مصطلحات الشعراء، بھائی وہ کتاب تمہاری ہے۔ میں نے غصب نہیں کی۔ میرے پاس مستعار ہے۔ دیکھ چکوں گا، بھیج دوں گا۔ تقاضہ کیوں کرو؟"

علائی نے غالبًا اپنے کسی قصیدہ اور مرزا کی یا اپنی ہی رباعیوں کا تقاضہ کیا ہے۔ ان پر اظہار غضب ملاحظہ ہو، ظرافت آمیز اظہارِ غضب کی اس سے بہتر کوئی اور مثال خطوطِ غالب میں نہیں ہے:

"مکرر لکھ چکا کہ قصیدہ کا مسودہ میں نے نہیں رکھا۔ مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں کہ کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج، قصیدہ بھیج، معنے اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرر بھیجے گا، بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم۔ دساتیر کی قسم۔ ژند کی قسم پاژند کی قسم، استا کی قسم۔ گرو کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔۔۔۔۔؟"

اظہار افسوس تک میں غالب شوخی سے باز نہیں آتے، اپنی تصویر انھوں نے شاہزادہ بشیر الدین کو بھیجی لیکن اس کی رسید ان کو نہ ملی۔ اظہار افسوس کی شوخی ملاحظہ ہو:۔

"سرنامہ دیکھ کر سفیدۂ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا، اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا۔۔۔۔۔۔۔ ظاہرا ڈاک پر ڈاکو گرے اور مرے پیکر بے روح کے ٹکڑے اڑا دیئے۔۔۔۔؟"

مرزا کی شوخیٔ طبع کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ ہم عمروں اور خوردوں سے تو شوخی کرتے ہی ہیں، بزرگوں اور اپنے لئے قابلِ احترام اشخاص سے بھی شوخی کرنے سے باز نہیں آتے۔ حضرت سید شاہ عالم صاحب مارہرہ کے ایک بزرگ تھے جن کا غالب بڑا احترام کرتے تھے لیکن ایک بار جب غالب نے ان کا سنہ ولادت دریافت کیا اور انھوں نے جوابًا لکھا کہ میرا سنہ ولادت لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے تو مرزا کی رگِ شوخی وظرافت پھڑکی اور انھوں نے ان کو یہ شعر لکھ بھیجا:۔

بالفِ غیب شب کو یوں پوچھا
ان کی تاریخ میرا تاریخا

لفظ "تاریخا" سے مرزا کا سنہ ولادت ۱۲۱۲ھ نکلتا ہے۔

مرقع نگاری اور منظر نگاری میں بھی مرزا کی شوخی و شگفتگی طبع قابلِ داد ہے، وہ خواہ بی وفادار کے بازار سے سودا سلف لانے کی منظر کشی ہو یا برسات میں اپنے مکان کی چھت کے اس طرح چھلنی ہو جانے کا واقعہ کہ "مینہ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے"۔ مرزا کی شوخی ہر جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ میر مہدی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں بھولا نہیں تجھ کو اے میری جاں
کروں کیا کہ یاں گر رہے ہیں مکاں

برسات کا حال نہ پوچھو خدا کا قہر ہے، قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔۔۔۔۔" اسی طرح علائی کے نام بھی برسات کی تباہ کاریوں کی منظر کشی ہے۔ تفتہ کے نام اپنے مکان کی خستہ حالت بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔" کشتیٔ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اب نجات ہوئی ہے"۔

کسی سے کوئی شے طلب کرنے میں بھی شوخی سے باز نہیں آتے۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں سے اپنا دیوان بغرض اشاعت طلب کرتے ہیں تو اندازِ طلب کی شوخی ملاحظہ ہو:۔

"جناب قبلہ و کعبہ۔ آپ کو دیوان دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہے یہ بھی نہیں پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔۔۔۔؟"

مرزا کا اندازِ تحریر کچھ ایسا شگفتہ ہے کہ وہ عیادت یہاں تک کہ تعزیت کے خطوط میں بھی شوخی کے مظاہرہ سے باز نہیں آتے لیکن یہ مظاہرہ ایسا ہوتا ہے کہ بیمار یا غم گسار کے دل کو اس سے تکلیف نہیں پہنچتی بلکہ اس کے برعکس اس کا دل بہلتا ہے اور وہ اپنی بیماری کا دکھ یا عزیز کی موت کا غم ایک لمحہ کے لئے فراموش کر دیتا ہے اور یہی مرزا کا مقصد ہوتا ہے۔ میر مہدی کو بخار آ گیا ہے اطلاع ملنے پر عیادت کس شوخ انداز کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

"برخوردار نورچشم میر مہدی کو بعد دعائے حیات و صحت کے معلوم ہو کہ بھائی تم نے بخار کو کیوں آنے دیا، تپ کو کیوں چڑھنے دیا۔ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو مانع نہ آئے۔ تپ اتین بن کر آئی تھی جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے۔۔۔۔"

اسی طرح میر مہدی کی آنکھیں دکھنے آئیں تو لکھا کہ "تم نگوڑا چشم بیمار کیا جانو۔۔۔۔"

تعزیتی خطوط میں جب مرزا اپنی شوخی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کی عظمت اور ذہانت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تعزیت بڑا نازک کام ہے اور اس میں شوخی و ظرافت کی کوئی گنجائش نہیں، لیکن مرزا نے یہ گنجائش نکالی ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ بے اختیار منہ سے واہ واہ نکلے۔ تفتہ کے کسی عزیز یا دوست امراؤ سنگھ کی دوسری بیوی کا انتقال ہوگیا تو تفتہ نے اس کی اطلاع مرزا کو دی ہے۔ مرزا کے تعزیتی خط کی شوخی ملاحظہ ہو :-

"۔۔۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار ان کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندہ گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ دم ہی نکلتا ہے۔۔۔"

تعزیتی خطوط میں شوخی کی بہترین مثالیں مرزا کے وہ دو خط ہیں جو انھوں نے اپنے دوست مرزا حاتم علی مہر کو ان کی محبوبہ چنا جان کے انتقال پر ان کو تحریر فرمائے، پہلے خط میں گلفشانی تحریر ملاحظہ ہو :-

"۔۔۔ مغل صاحب شعراء میں فردوسی اور فقراء میں حسن بصریؒ اور عشاق میں مجنوں، یہ تین آدمی تین فن میں سر دفتر اور پیشوا ہیں۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔ فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصریؒ سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم طرحی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری بلکہ تم اس سے بڑھ کر ہوئے کہ لیلیٰ اپنے گھر اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔۔۔۔"

دوسرے خط میں انہیں اس طرح تسلی دیتے ہیں :-

"مرزا صاحب ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔۔۔۔۔ کیسی اشک فشانی؟ کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجا لاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسے ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو چنا جان نہ سہی منا جان سہی۔۔۔۔۔"

ڈاکٹر خورشید الاسلام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "غالب کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ زندگی کے غموں کو نشاط میں تبدیل کر دیتے ہیں" اور یہ بات بالکل سچی ہے۔ وہ مفلس کو بھی اس نشاط سے جاتا ہے کہ اس کا دامن نگاہ خیال زخم سے پر گل ہوتا ہے اور جب شام فراق کو اس کی آنکھوں سے جوئے خوں رواں ہوتی ہے تو وہ انہیں دو شمعیں سمجھ لیتا ہے اور غموں کو نشاط میں تبدیل کرنے کا یہ کمال غالب نے اپنی شاعری ہی میں نہیں بلکہ اپنی نثر نگاری میں بھی دکھایا ہے۔ ان کی پوری شخصیت ہی غموں کو نشاط میں تبدیل کرنے کا نام ہے۔ ذرا دیکھئے کہ وہ اپنے غموں کو نشاط میں کس طرح تبدیل کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف ان کے لئے تسکین بخش ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کے لئے بھی سامان ظرافت بن جاتے ہیں۔ سارے بدن پہ پھوڑے نکلے ہیں، میاں داد خاں سیاح کو لکھتے ہیں :- "۔۔۔۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے۔۔۔۔" اور اسی طرح منشی حبیب اللہ خاں ذکا کے نام ایک خط میں انہیں پھوڑوں کا ذکر یوں ہوتا ہے۔

"۔۔۔ پھوڑوں سے بدن لالہ زار۔ پوست سے ہڈیاں نمودار۔۔۔"

تفتہ کے نام ایک خط میں اپنی بیماری کا مذاق دیکھئے کس طرح اڑایا ہے :"۔۔۔ سامعہ مر گیا تھا اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔۔۔۔"

اب ذرا مرزا قربان علی بیگ سالک کے نام ایک خط ملاحظہ ہو۔ کیسے تیکھے اور طنزیہ انداز میں اپنی محرومی و مفلسی کا مذاق اڑایا ہے :-

"۔۔۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچا ہے کہتا ہوں کہ لو غالب کے ایک اور جوتی لگی، بہت اتراتا تھا کہ میں

بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں۔ آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب کیا مرا بڑا ملحد مرا بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہ تعظیم جیسا بادشاہوں کو بعد ان کے جنت آرام گاہ و عرش نشیمن خطاب دیتے ہیں، چونکہ یہ اپنے کو شاہ قلمرو سخن جانتا تھا، سقر مقر اور ہاویہ زاویہ خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ آئیے نجم الدولہ بہادر، ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں اجی حضرت نواب صاحب، نواب صاحب کیسے اور خاں صاحب آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کچھ تو اکسو کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت۔ کوٹھی سے شراب۔ گندھی سے گلاب۔ بزاز سے کپڑا میوہ فروش سے آم۔ صراف سے دام قرض لئے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کہاں سے دوں گا.....؟

دیکھا آپ نے اپنی بیماری، دکھ اور تہی دامنی و تنگ دستی کو کس ظریفانہ اور طنزیہ انداز میں بیان کیا ہے کہ مکتوب الیہ ایک بار تو پڑھ کر مسکرا ہی دے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں :-

"اکبر کے خطوط میں ان کی بیماری کا رونا دیکھئے اور غالب کے شگفتہ اور پر لطف فقروں سے مقابلہ کیجئے تو دونوں کا فرق واضح ہو جائے گا۔" اور واقعی دونوں کے خطوط میں ان کی بیماریوں کا حال پڑھ کر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ظرافت و شوخی کسے کہتے ہیں اور حسِ لطیف (SENSE OF HUMOUR) کیا ہے۔

مرزا محمد عسکری مرحوم مرتب "ادبی خطوطِ غالب" لکھتے ہیں:-

"اکبر مرحوم ظریفانہ نظم میں اپنا عدیل و نظیر نہیں رکھتے تھے۔ اسی طرح غالب بھی شوخ و ظریفانہ نثر میں یگانہ و منفرد تھے مگر تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اکبر اپنا ظریفانہ انداز اپنی نثر میں پیدا نہ کر سکے کیونکہ ان کے خطوط میں کوئی خاص دلآویزی اور شوخی و ندرت مثل غالب کے خطوط کے ہم کو نظر نہیں آتی.....؟"

آپ نے ملاحظہ کئے غالب کی شگفتگیِ طبع کے یہ شگوفے۔ ان کے خطوط کی یہی شوخی و شگفتگی ہے یہی دل آویزی ہے جس نے ان کے خطوط کو انفرادیت بخشی ہے۔ ایسی انفرادیت جسے صحیح معنوں میں انفرادیت کہا جا سکتا ہے کیونکہ بقول ڈاکٹر تنویر احمد علوی ——

"انفرادیت اسلوب کے معنی ہی یہ ہیں کہ پھر کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو سکے" —— اور غالب کے خطوط میں ان کی شگفتگی، شوخی اور طنز و مزاح نے یہی خوبی پیدا کر دی ہے کہ ان کی تقلید بہت مشکل بن گئی ہے۔ ان کے خطوط کی اس خوبی کو ہر دور کے اہلِ قلم نے گلہائے تحسین و تعریف کا خراج پیش کیا ہے

مولانا محمد حسین آزاد اس طرح رقم فرما ہیں: "ان خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں۔ یہ انہیں کا ایجاد تھا۔ آپ مزا لیا اور اوروں کو لطف دے گئے۔ دوسرے کا کام نہیں ——"

پروفیسر آل احمد سرور "خطوطِ غالب" مرتبہ مالک رام کے "تعارف" میں لکھتے ہیں :-

"ان خطوں میں وہ بے تکلفی اور رنگت ہے جس کی وجہ سے غالب آج اردو دنیا میں سب سے زیادہ محبوب ہیں"

پروفیسر رشید احمد صدیقی فرماتے ہیں: "اگرچہ غالب کی شاعری میں بھی "چیزے دیگر" اور "ورائے شاعری" کا عنصر شامل ہے مگر ان کے خطوط میں ان کی شخصیت کی پہلوداری، دل آویزی اور انوکھا پن زیادہ ستھرے اور نکھرے ہوئے روپ میں سامنے آیا.....؟"

غرض کہاں تک ان کے خطوط کی اس انفرادیت کا تذکرہ کیا جائے کیونکہ بقول شاعر ؎

داماں نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کے خطوط کی دلکشی

ان کی شگفتگیِ طبع ۔ بے تکلفی ۔ طنز و ظرافت اور شوخی میں پوشیدہ ہے ، غالب نے اُردو شاعری کو نیا رنگ و آہنگ دیا ، لیکن اُردو نثر کو انھوں نے نئی زندگی دی ہے ۔ وہ اُردو نثر خصوصاً مکتوب نویسی میں ایک نئے طرز کے بانی اور شاہراہِ نثر پر ایک نئے قافلے کے رہنما ہیں ۔

"اُردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" شاہراہِ نثر پر روشن دو ایسے چراغ ہیں جن سے اُردو ادب کے عناصرِ خمسہ سر سید احمد خاںؔ شبلیؔ ، حالیؔ ، آزادؔ اور مولوی نذیر احمد نے اکتسابِ نور کیا اور اُردو نثر میں جدید راہیں دریافت کیں ۔

اگر دیوانِ غالبؔ کو لوگ ہندوستان کی دوسری الہامی کتاب سمجھتے ہیں اور اسے آنکھوں سے عینک کی طرح لگاتے ہیں تو "اُردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" بھی نثر کے دو ایسے صحیفے ہیں جو ہمیشہ سینے سے لگائے جاتے رہیں گے ۔

نوٹ :۔ حوالے اور خطوط کے اقتباسات مندرجہ ذیل کتب و رسائل سے لئے گئے :۔

۱۔ اُردوئے معلّٰی ، شائع کردہ مطبع مجیدی ۔ کان پور ، ۱۹۲۲ء
۲۔ عودِ ہندی ، شائع کردہ مطبع نول کشور ، لکھنؤ ، ۱۹۴۱ء
۳۔ خطوطِ غالب ، مرتبہ مالک رام شائع کردہ انجمن ترقیٔ اُردو علی گڑھ ، ۱۹۶۲ء
۴۔ ادبی خطوطِ غالبؔ ، مرتبہ مرزا محمد عسکری مرحوم شائع کردہ مبارک بکڈپو ۔ کراچی ، ۱۹۶۴ء
۵۔ یادگارِ غالبؔ ، مؤلفہ مولانا حالیؔ مرحوم ، شائع کردہ شانتی پریس ۔ الہ آباد ،
۶۔ ماہنامہ ادیبؔ ، علی گڑھ (نصاب نمبر) ۔ بابت اگست ۱۹۶۲ء
۷۔ ماہنامہ کتابؔ ، لکھنؤ ،

محمد شفیق

غالب کی گلیوں میں

دہلی کے مشہور بازار چاندنی چوک سے بلی ماران کی جانب مڑیئے اور اس ٹیڑھے ترچھے راستے میں جوتوں اور ریکس کی تھوک بیچنے والوں کی دکانوں کو چھوڑتے ہوئے لوگوں کے ہجوم میں دائیں بائیں ٹھیلوں سے بچتے، آتی جاتی رکشاؤں سے دامن بچاتے، جھلی والوں کے درمیان سے نکلتے اگر آپ صحیح و سالم کافی دور تک اندر چلے آئیں تو دائیں طرف آپ کو شمسی دواخانے کا عمر رسیدہ بورڈ نظر آئے گا۔ پھر ایک دو دھیا رنگ کی دکان میں شیشے محل دیکھ کر آنکھیں چندھیانے لگیں گی۔ لیکن یہ چمک فضا میں سجے ہوئے کالے، سفید، نیلے، سادے، سنہری، چمکدار جوتیوں کی وجہ سے کچھ کم ہو گی تو نظر اٹھتے اٹھتے دکان پر آویزاں "چاند آپٹیکا" کے سائن بورڈ سے پھسل کر ایک بڑے سے پرانے جنگلے پر جم جائے گی۔ اور اندر کی طرف دیکھ کر جب آپ بیساختہ بائیں جانب گردن گھمائیں گے تو کبریا منزل کے گودام نما پھاٹک کے بعد چند دکانیں چھوڑ کر ہر مرض کی دوا گاہ یعنی جنرل مرچنٹ کے قریب ہی "بوٹینیکل عجائب گھر" یا جڑی بوٹیوں کی ایک دکان پائیں گے۔ اس کے برابر ہی تندور دروانہ کے کھٹملوں اور جوؤں کی شمشان گاہ کپڑوں کی ایک لانڈری۔ اس عجائب گھر و رنگم گاہ کے سامنے آپ کو ایک گلی نظر آئے گی۔ جہاں کافی دور تک بھی اگر آپ ناک کی سیدھ میں چلے جائیں تو آپ کی ناک کو خطرہ لاحق نہ ہو۔ گلی کی محافظت کے لئے دائیں بائیں دو بجلی کے کھمبے مستعدی سے کھڑے نظر آئیں گے۔ اسے گلی قاسم جان کہتے ہیں۔ قاسم جان اٹھارویں صدی میں شاہ عالم کے دور میں اور مغلیہ سلطنت کے انتزاع کے زمانہ میں اپنے دو بھائیوں کے ساتھ دارالسلطنت پہنچے اور اسی گلی کے مکین ہو گئے، قاسم جان کی قسمت کا ستارہ پہلے بلند اقبالی کو پہنچا بعد میں عارف جان بھی اس مرتبہ کو پہنچے۔ عام طور پر مورخوں نے ان کے ناموں کے آگے جان لفظ کا استعمال کیا ہے۔ لیکن اسی گلی کی ایک بزرگ معزز شخصیت نواب خسرو مرزا نے مجھ سے کہا "میں ان کا نام قاسم جان ماننے پر قطعی آمادہ نہیں، کہیں ایک مورخ نے یہ لکھ دیا اور بعد کے مورخ اس کی پیروی کرنے لگے۔ حالانکہ مجھے ایک قدیم سرکاری گزٹ میں ان کا نام قاسم خاں چھپا ہوا ملا ہے۔ اور میں بھی یہی مانتا ہوں کیونکہ "جان" صرف پیار کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جبکہ خان ایک نسل کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر انہیں جان پیار کے طور پر کہا جاتا تو پھر چھوٹے بھائی کا نام عارف خان نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ گلی کی مسجد میں جو کتبہ لگا ہوا ہے اس پر بھی قاسم خان ہی کندہ ہے۔"

غرض جب آپ گلی میں داخل ہوں گے تو دائیں جانب قدیم وضع کی خوبصورت سی عمارت پائیں گے۔ یہ ہندوستانی دواخانہ ہے۔ بائیں جانب کی دکانوں کی پیشانی پر آپ کو گیروے رنگ کی محرابوں کا ایک بالائی رسا نظر آئے گا جو مسجد ہونے کی علامت ہے۔ اسے حکیم شریف کی مسجد کہا جاتا ہے اب اس خدا کے گھر کی

صورت بھی لوگوں نے جدید سی بنا دی ہے۔ اس سے لگی ہوئی ایک قدیم
عمارت ہے جس کے زینے پر اب آپ کو اصغر علی ایڈووکیٹ کی تختی لگی ہوئی ملے
گی اس یک منزلہ عمارت کے نیچے ایک بوسیدہ سے بورڈ پر اگر آپ نظریں
جما کر دیکھیں تو دواخانہ مجلس اطبار لکھا ہوا نظر آئے گا۔ دو بڑے بڑے
پھاٹکوں کے عمر رسیدہ دروازے ٹوٹی پھوٹی میز، بوسیدہ سی آثار قدیمہ
کی یادگار چند فرسودہ کرسیاں اور حکیمی دور کی تاریخ کی منہ بولتی تصویریں آپکو
خالی الماریوں کی شیشیوں میں بند نظر آئے گی۔ اس کے پہلو میں دو بڑے
بڑے خستہ گودام ہیں۔ اِن اندھیرے گوداموں کو اب لکڑی کی ٹال کہا
جاتا ہے۔ پھر ایک ذرا اچھی سی صاف ستھری سی بھڑ بوجے کی دکان ہے،
اس کے برابر میں کشادہ سا زینہ ہے جہاں نیچے ہی لیٹر بکس پر انگریزی میں
عبدالغفار ایل۔ اے، لکھا ہوا ملے گا اس کے بعد پھر لکڑی کی ٹال اپنی
چھت کی محرومی پر افسردہ سی کھڑی ہے۔ کہتے ہیں عبدالغفار اور
اصغر علی کے زینوں تک کا درمیانی حصّہ مرزا غالب کی رہائش
گاہ تھی۔ یہ حصّہ آج سو برس گذر جانے کے بعد بھی ان کی تمام عمر
کی پریشان حال و پراگندہ زندگی کی منہ بولتی تصویر ہے اس کی لکڑی
کی ٹال کے مالک محمد ابراہیم ہیں جن کی عمر ۹۰ سال ہے۔ انھوں نے
اپنی ٹال کے سامنے ایک سلیٹی سے رنگ کی چارپائی پر بیٹھے حقّے کا
لمبا کش لیتے ہوئے مجھے بتایا "ہم یہاں چالیس سال سے یہی کاروبار
کر رہے ہیں۔ جب ہم نے یہ جگہ لی تھی تو یہ موٹر گیرج کے طور پر
استعمال ہوتی تھی۔ اور اوپر چھت کے طور پر سائبان پڑا ہوا تھا۔ انھوں
نے کسی مصلحت کے طور پر مجھے غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کرتے
ہوئے بتایا۔ یہ لکڑی کی ٹال غالب کی رہائش گاہ نہیں تھی۔ بلکہ جہاں
یہ دواخانہ مجلس اطبار ہے غالب یہاں رہتے تھے۔ جبکہ پروفیسر
حمید احمد خاں نے ۱۹۴۲ء میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے گلی
میں چند قدم چلئے تو مسجد کے پیچھے (اور اس سے ملی ہوئی) ایک
دواخانے کی نئی عمارت کو چھوڑ کر وہیں ایک بڑی ڈیوڑھی نظر آتی
ہے۔ اندر جا کر دیکھئے تو مختصر سا صحن گرتی ہوئی عمارت کے ملبے سے

بھر بھرا کر کچھ اور مختصر ہو گیا ہے صحن کے مشرق کی طرف دو بوسیدہ
سے کمرے جو غالبًا پشتِ مسجد کا سہارا لئے ہوئے ہیں ابھی تک
اپنی سخت جانی کے اظہار کے لئے کھڑے ہیں۔ یہ ڈیوڑھی۔ یہ صحن،
اور یہی دو کمرے غالب کی آخری فرودگاہ کی یادگار ہیں۔ وہ بالاخانہ
جو خود اُن کے لقول" اِن کے بیٹھنے، اُٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے
کا محل تھا۔ اب باقی نہیں رہا" اِن کی اس تفتیش اور معلومات سے
کئی جگہ اختلاف کیا جا سکتا ہے انھوں نے مسجد کے پیچھے ملی ہوئی
جس دواخانے کی نئی عمارت کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ غالبًا یہی دواخانہ
مجلس اطبار کی عمارت ہے۔ جو کہ تقریبًا تیس پینتیس سال قبل وجود میں
آئی۔ دوسری جانب حمید صاحب نے صحن میں مشرق کی طرف دو بوسیدہ
کمروں کا ذکر کیا ہے جو مسجد کی پشت کا سہارا لئے ہوئے ہیں،
درمیان میں اس عمارت کے آجانے سے ان کمروں کا مسجد کی
پشت سے سہارا لینا بے معنی سا نظر آتا ہے۔ اس سلسلے میں نواب خسرو
مرزا، نے ایک حد تک صحیح معلومات فراہم کرتے ہوئے مجھے بتایا ۔
"گلی کے موڑ پر جو مسجد ہے اسے حکیم شریف والی مسجد کہا جاتا
ہے حکیموں کے خاندان کی ایک بزرگ شخصیت نے بنوائی تھی۔
اس سے لگی ہوئی جو عمارت ہے وہاں سے بھڑ بوجے کی دکان تک
کا حصّہ مرزا غالب کے تصرف میں رہا، ہاں غالبًا وہ بالاخانہ جو غالب
کی زندگی کے نشیب و فراز کا آماجگاہ رہا اُس زمانے میں ملبے کی صورت
میں موجود تھا۔ وہیں دواخانے کی یہ نئی عمارت بعد میں تعمیر ہوئی
اور اس طرح یہ نشانی اپنی اصل شکل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی
جبکہ نیچے کے یہ دونوں پھاٹک جہاں لکڑی کی ٹال ہے اب بھی غالبًا
اپنی قدیم صورت میں یا ایک حد تک جوں کی توں قائم ہیں اس
دواخانہ مجلس اطبار کے متعلق کہا جاتا ہے (بقول محمد ابراہیم کے)
"حکیمی خاندان کے دو افراد حافظ جمیل اور محمد احمد کے درمیان کچھ
ناچاقی اور کشیدگی پیدا ہوئی اور اس تفریق کی صورت میں ہندوستانی
دواخانہ اور دواخانہ مجلس اطبار بنا تھا۔ ہندوستانی دواخانہ کی جائداد

محمد احمد کی تھی جبکہ دواخانہ مجلس اطباء حافظ جمیل نے قائم کیا یہ جگہ بعد میں کسٹوڈین میں چلی گئی۔ اور پھر اسے حاجی فاروق نے خرید لیا بھڑبھوجے کی دکان پر جب پہنچا تو چالیس پینتالیس سال کی ایک اچھی خاصی صحت مند عورت سر پہ پیلی دھوتی میں پچوکڑی مارے پتیلیوں میں چنے بھون رہی تھیں۔ ایک سترہ سالہ لڑکا بھٹی میں آگ دھکا رہا تھا میرے پین کھولنے پر انھوں نے پین پکڑ لیا اور بولیں "پہلے مطلب بتاؤ کیا بات ہے۔ پھر پیچھے کچھ لکھنے دوں گی میرے سمجھانے پر انھوں نے غالب کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوئے بتایا "یہ دکان ہماری بہت پرانی ہے جو کہ میرے .... انھوں نے ...... میرا .... مطلب ہے پیارے لال نے لی تھی .... ان کا اب سورگباش ہو چکا ہے" اپنا نام بتانے سے انھوں نے انکار کیا حالانکہ میرا قلم کھلنے سے قبل وہ اپنا نام "دیپو" بتا چکی تھیں۔ اس دکان اور لکڑی کی ٹال کے اوپر کا مکان جس کا زینہ دکان کے پہلو میں ہے۔ اب عبدالغفار صاحب کے خاندان کی رہائش گاہ ہے اور اس کی صورت بھی اب بالکل بدل چکی ہے۔ زینہ کشادہ صاف ستھرا اور پختہ ہے۔ باہر کا بوسیدہ چھجہ اب ختم ہو چکا ہے بلکہ وہ اب مضبوط دیوار ہے جہاں روشندان کے طور پر چند سیمنٹ کی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔

اِن عمارات کے سامنے گلی کی دائیں جانب ہندوستانی دواخانہ اور پھر چھوٹی لکھوری اینٹوں کی پرانی دیوار دور تک چلی گئی ہے۔ اندرون دیوار آج کل ہندوستانی دواخانے کی دوائیاں بنتی ہیں۔ کہتے ہیں یہ غالب کا زنان خانہ تھا۔ نواب خسرو مرزا نے بتایا "ہماری نانی کہتی تھیں یہ غالب کی محلسرا تھی اور یہاں ان کی اہلیہ امراؤ بیگم رہتی تھیں اور یہ حویلی حکیم محمود خاں کی بیوی کی جائیداد تھی۔ امراؤ بیگم ان کی بیوی کی دوپٹہ بدل بہن تھیں اس وجہ سے وہ اس میں اپنا ہی مکان سمجھ کر رہتی تھیں اس کے عوض ان سے کبھی کچھ نہیں لیا گیا" اس کے برعکس ابراہیم صاحب نے کہا "میاں .... یہ سب امیر مل کے چونچلے تھے۔ روپے کی فراوانی تھی ...... لوگوں کے پاس حویلیاں کی حویلیاں خالی پڑی تھیں۔ اسی لئے انھوں نے مرزا کو بھی دے دیا تھا" اس محل سرا کی شکل بھی اب بالکل بدل چکی ہے جو جگہ کبھی امراؤ بیگم کی خدا پرستی، اور عبادت کے نور سے منور اور مرزا غالب کے طنز و مزاح اور نوک جھوک سے آباد تھی اب وہ دوائیوں کی مہک سے معطر رہتی ہے۔ یہاں پہلے ایک بیری کا درخت تھا جس کا اب نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اس گلی میں جب ناک کی سیدھ میں آگے بڑھیں گے تو جہاں آپ کی ناک کو خطرہ لاحق ہوگا۔ وہاں کنارے پہ ایک محراب نما پھاٹک ہے۔ دائیں جانب سگریٹ بیڑی کی الماری لگی ہوئی ہے۔ اور بائیں جانب الماری میں کوکا کولا اور گولڈ اسپاٹ کی بوتلیں لگی ہوتی ہیں۔ اوپر جامعہ طبیہ کا بورڈ آویزاں ہے۔ اس کے نیچے درمیان میں ایک سفید چوکور بورڈ لگا ہوا ہے جس پر سرخ ریڈکراس کی کانٹی بنی ہوئی ہے اسے بھی عارف جان کے بیٹے نواب احمد بخش خاں کی حویلی کہا جاتا تھا اور یہیں عارف جان کا زنان خانہ تھا کہتے ہیں یہاں غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف بھی رہا کرتے تھے۔ اور غالب دہلی آنے کے بعد ابتدائی ایام میں کچھ روز یہاں بھی مقیم رہے۔ اس پھاٹک میں بائیں جانب کا حصہ بالکل بدل گیا ہے۔ صاف ستھری جگہ بڑے بڑے کمرے پختہ در و دیوار دیواریں اور نئے نئے ڈیسک اور کرسیاں۔

یہ آجکل جامعہ طبیہ کالج ہے۔ جبکہ دائیں جانب بوسیدہ قدیم عمارتیں ہیں۔ پھاٹک سے باہر نکل کر گلی قاسم جان میں بائیں جانب مڑیں گے تو سامنے ایک پتلی سی لمبی گلی نظر آئے گی۔ اسے نیا محلہ کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی غالب کچھ روز رہائش پذیر رہے۔ نواب خسرو مرزا نے بتایا "پہلے یہ گلی قاسم جان ہی کہلاتی تھی ہاں گلی میں داخل ہوتے ہی بائیں طرف جو پھاٹک اندر تک چلا گیا ہے اسے نیا محلہ کہتے تھے اور یہاں اس زمانے میں جولاہے رہتے تھے۔ انھوں نے کہا "یہ گلی قاسم جان اور اس گلی کی سطح زمین میرے دیکھتے دیکھتے تقریباً ایک گز اونچی ہو گئی ہے۔ یہ گلی بھی اب بہت کچھ بدل گئی ہے دائیں طرف

ایک نئی اور بلند عمارت بن گئی ہے باقی کچھ دوسرے مکان بھی کافی ماڈرن ہو چکے ہیں۔ جب ہم پھر دائیں طرف مڑ کر آگے بڑھیں گے تو بائیں ہاتھ پر قاسم جان کی مسجد ہے .... پھر آگے ...... احاطہ کالے صاحب کا پھاٹک وہ سیڑھ یہاں نیچے اتر کر ہے۔ یہاں سیڑھیوں کے بجائے ڈھال تھی۔ آگے بڑھنے پر دائیں جانب ایک تپلی سی گلی ہے۔ اس کے برابر میں ایک کھلا سا ہوٹل اور پھر ذرا سا اندر ہو کر ایک اندھیرا سا ناہموار پھاٹک ہے۔ جہاں "پھاٹک نواب لوہارو" کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ غالب کے زمانے میں یہ کوٹھی نواب لوہارو کہلاتی تھی۔ غالب یہاں بھی کچھ عرصے مقیم رہے۔ یہ کافی بڑی حویلی ہے ...... شکل و صورت بدل جانے کے باوجود اپنا قدیم رنگ لئے ہوئے ہے۔ اندر اندھیرا ہے سطح زمین ناہموار ہے۔ .... مکانات کے باہر غالباً برسوں سے سفیدی نہیں ہوئی یہاں سے اور آگے بڑھیں گے تو یہ گلی "لال کنویں کی طرف نکل جاتی ہے" یہ گلی غالب کی بیس بائیس برس کی عمر سے مرتے دم تک ان کا مسکن رہی اور ان کے قصے، ان کے لطیفے، اور ان کے شعر یہاں کے گھر گھر میں گونجتے رہے۔ یہ گلی ان کی زندگی میں ان کے موکہ شکہ کی ساتھی رہی۔ یہیں[1] پر غالب کے چچا نصر اللہ بیگ کی شادی عارف جان کی صاحبزادی سے ہوئی اور یہیں پر اس کے پندرہ سال بعد، ۷ رجب ۱۲۲۵ھ و ۹ اگست ۱۸۱۰ء کو مرزا غالب دولہا بن کر آئے اور اپنی چچی کی بھتیجی، مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی صاحبزادی اور عارف جان کی پوتی امراؤ جان سے ان کا عقد ہوا اور پھر غالباً ساٹھ سال بعد اس ضعیف شاعر کا جنازہ ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء بروز پیر اسی گلی سے اٹھا یہیں کے لوگوں نے ان کے عزیزوں، مداحوں، شاگردوں اور احباب نے انہیں کندھا دیا اور درگاہ حضرت نظام الدین میں انہیں سپرد خاک کیا۔ اسی گلی میں اس کے

ایک سال بعد ان کی اہلیہ امراؤ بیگم کا بھی انتقال ہوا۔ یہیں نواب خسرو مرزا رہتے ہیں جو غالب کے قرابت داروں میں سے ہیں۔ مرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ نواب خسرو مرزا کے پر دادا کے پھوپا تھے، جناب نواب زین العابدین خاں عارف جنھیں مرزا غالب نے گود لیا تھا نواب خسرو مرزا کی والدہ کے دادا تھے۔ اس کے علاوہ نواب خسرو کے دادا نواب ضیاء الدین خاں مرزا غالب کے شاگرد بھی تھے لوہارو خاندان سے ان کا ددھیال کا رشتہ ہے۔ اور نواب زین العابدین عارف سے ننھیال کا، مرزا غالب اس خاندان سے ہمیشہ وابستہ رہے اسی سلسلے میں نواب خسرو مرزا نے مجھے بتایا، "مرزا غالب کی زندگی ہمارے گھرانے سے وابستہ تھی۔ وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتے تھے۔ کیونکہ ان کے اجداد میں کوئی نہیں تھا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ "جب میں علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا جانے کس طرح مولانا حالی کو معلوم ہو گیا کہ میں مرزا غالب کے رشتہ داروں میں سے ہوں وہ میرے پاس پہنچے اور مجھ سے رشتہ پوچھا میں نے کہا وہ میرے دادا تھے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کیونکہ اس وقت میری عمر صرف تیرہ سال تھی۔ انھوں نے ہمارے کسی بزرگ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں انہیں گھر لایا لیکن ہماری نانی اماں پردے کی وجہ سے ان سے نہیں مل سکیں ہاں میں نے ایک ضعیف نوکر کلو سے انہیں ملوا دیا ۱۹۴۶ء میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے لکچرار مہیش پرشاد صاحب ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھ تک پہنچے۔ اس کے بعد مالک رام صاحب نے مجھ سے اس سلسلے میں معلومات فراہم کیں۔" انھوں نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا "ہماری نانی کے پاس مرزا غالب کی ایک لکڑی (عصا) اور ٹوپی تھی جو بعد میں گم ہو گئی میرے پاس ان کا غیر مطبوعہ کلام تھا جو سائل صاحب مجھ سے لے گئے تھے نہ معلوم انھوں نے اس کا کیا کیا"

---

[1] غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک۔ پروفیسر حمید احمد خاں "آجکل" ۱۵ فروری ۱۹۴۷ء

۱۹۴۷ء میں میرا کتب خانہ لٹ گیا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے
اس میں علاؤ الدین خاں کی کتابیں اور بہت سے غالب کے خطوط
بھی تھے۔ وہاں عارف جان کے انتقال کے بعد مرزا غالب نے
ہمارے نانا باقر علی کو اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے یہاں ہماری بڑی
خالہ محمد سلطان بیگم عرف جنتو بیگم پیدا ہوئیں، مرزا غالب اُن کو
بہت چاہتے تھے۔ نواب خسرو مرزا نے مالک رام صاحب کی کتاب
ذکرِ غالب سے کئی جگہ اختلاف کیا: "ذکرِ غالب میں مالک رام
صاحب نے نواب احمد بخش کی دو بیویاں تحریر کی ہیں جبکہ اُن کی
تین بیویاں تھیں۔ پہلی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ دوسری میرات کی
تھیں۔ اور تیسری، دوسری بیوی کی بہن تھیں (رنڈی) دوسری
بیوی کے بطن سے ہمارے پردادا پیدا ہوئے تھے" اس کے
علاوہ نواب صاحب نے نصراللہ بیگ کے انتقال کے بعد
ایک سرکاری وظیفے وغیرہ سے بھی اختلاف کیا۔ بڑھاپے سے قبل
مرزا غالب کی خانگی زندگی کا یہ معمول تھا کہ وہ بیشتر حصہ اپنے
دیوان خانے میں گذارتے تھے۔ ناشتے کے بعد بالاخانے میں دوستوں
کو خط لکھتے، پھر ظہر کے وقت چوسر یا شطرنج میں وقت بتاتے
تھے۔ یا پھر کوئی کتاب پڑھتے۔ گرمیوں میں اس وقت سو جاتے،
سہ پہر ملنے جلنے والے ان کی ملاقات سے فیض یاب ہوتے نیچے
ڈیوڑھی میں جہاں آج کل لکڑی کی ٹال ہے مرزا غالب اپنے
شاگردوں اور احباب کے ساتھ محفل جماتے اور خود مونڈھے
پر چوکڑی جما کر، چپلیں اُتار کر بیٹھ جاتے۔ حقّہ دائیں جانب
ہوتا ضعف کے باعث اونچا سننے کی وجہ سے کان پر ہاتھ
رکھ کر ملاقاتیوں سے مخاطب ہوتے۔ ایک موٹی سی عصا
لے کر دو ایک بار محل سرا میں بھی ضرور جاتے۔ ۱۹۳۰ء میں گلی
قاسم جان میں مرزا غالب کے دوست نواب ضیاء الدین خاں نیّر
رخشاں کی صاحبزادی اور عارف جان کی پڑپوتی، مرزا زین العابدین
کی بہو اور باقر علی کی بیوی زمانی بیگم عرف ننگا بیگم رہتی تھیں۔ عارف
کے انتقال کے بعد مرزا غالب نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو
اپنے ساتھ رکھا اور باقر کی شادی بھی غالب ہی نے کی۔ اس طرح
یہ محترمہ غالب کے گھر دُلہن بنکر آئیں۔ اُنھوں نے بہ وحید احمد
خاں کو بتایا کہ مرزا غالب کی آخری عمر میں وہ وہاں پر موجود تھیں،
مرزا غالب کی اہلیہ نماز روزہ کی پابند تھیں۔ دونوں کے مزاج...
مختلف تھے جس کی وجہ اکثر لڑائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ امراؤ بیگم
خفا ہونے کے باوجود خاموش ہو رہتیں۔

غالب پچھلے پہر ہوا خوری کو جاتے، اپنے چھوٹے پوتے حسین علی
خاں کو ڈانٹتے ڈپٹتے رہتے۔ اُن کا ملازم کلو جو دہ برس کی عمر
سے اُن کے ساتھ تھا۔ اُن کا دوسرا ملازم مدار خاں تھا۔ لوگوں
سے اچھی طرح پیش آتے تھے۔ دوپہر کا کھانے اور دوسرے
وقت حلوا سوہن، کباب۔ بادام وغیرہ کا استعمال کرتے تھے۔
کڑھی کی پھلکیاں شوق سے کھاتے تھے۔ شراب پینے پر بکنے
والے کو بُرا بھلا کہتے چنے کی دال سے خاص رغبت تھی، بیگم
نے مزید بتایا "نواب معظم علی خاں کے پاس مرزا غالب کا ایک
پیالہ تھا، جو وہ بھوپال لے گئے تھے۔ اُن کے مذہب کا کوئی
ٹھکانہ نہیں تھا، مرزا غالب کے انتقال کے بارے میں انھوں نے
بتایا" اُن کا انتقال دیوان خانے میں ہوا۔ جہاں پھر بعد میں
مجید خاں نے اپنا اصطبل بنوا لیا تھا۔

میں نے گلی قاسم جان کی ایک خاتون سے جب غالب
کے بارے میں کچھ جاننا چاہا تو وہ پھٹ پڑیں اور گویا ہوئیں۔
"چل ہٹ میں اُس شرابی کے متعلق کچھ بتاؤں گی ہم نے تو یہی
سنا ہے شراب وراب بہت پیتا تھا" ابراہیم صاحب نے
مجھے بتایا۔ یہاں .... یہ تو سب آج کل کا رونا ہے پہلے
تو غالب کا نام بھی سُننے کو نہیں آتا تھا۔ یہ تو اب کچھ ہی دن
سے ایسا ہوا ہے کہ غالب غالب کی رٹ لگی ہوئی ہے۔ ایک
دس سالہ بچے نے کہا۔ غالب بہت بڑے شاعر تھے۔ بڑی

(باقی صفحہ ۱۲۱ پر پڑھیے)

محمد اقبال قریشی

غالب

اپنی انانیت کے آئینے میں

"ہم اپنے آثار کو ہر چیز سے بچالے جاسکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچاسکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیر غائب اور ضمیر حاضر کے پردوں میں چھپ کر ملیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے۔ ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مصور، ایک اہلِ قلم کی انانیت کیا ہے؟ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے وہ دبا نہیں سکتا اور اگر دبانا چاہتا ہے تو اور زیادہ ابھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے"۔ ابوالکلام آزاد

انانیت ہمیشہ اعلیٰ فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں میں پائی جاتی ہے۔ معمولی فنکار کو یہ جرارت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی عظمت کا دعویٰ کرے انانیت ہمیشہ انہیں اشخاص میں ملتی ہے جن کے حوصلے بلند ہوں، جن کے عزائم میں سمندروں کی وسعت اور طوفانوں کی ہماہمی ہو اور جو کچھ کرنے کی صلاحیت لے کر آئے ہوں۔ انانیت پسند شعراء و ادبا اعلیٰ تخلیق پیش کرتے ہیں۔ غالب اور ابوالکلام آزاد نے اردو ادب میں اعلیٰ تخلیقات پیش کی ہیں۔ ہر اعلیٰ فنکار انانیت کا کچھ نہ کچھ شکار ہوتا ہے۔ انانیت میں فن کی عظمتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ فخر محسوس کرنا انسانی فطرت ہے۔ اگر کوئی اہلِ قلم اوروں سے ممتاز ہوتا ہے تو وہ اپنے مخصوص امتیاز اور صلاحیت پر فخر کرتا ہے جس طرح حسینوں کو اپنے حسن پر فخر ہوتا ہے اور اس کا احساس ہوتا ہے سارے انسانی طبقات میں صرف شعراء کو معاشرے نے یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنی تعریف آپ کریں۔ اگر شعراء کے علاوہ کوئی اپنی تعریف خود کرے تو لوگ اس کا مضحکہ بنالیں۔ فخر کسی غلط کام کے لئے نہ ہو تو اچھی چیز ہے۔ اس سے دوسروں کو آرزو کی دولت عطا ہوتی ہے اور کام کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ شاعرانہ تعلیاں انانیت کا عکس ہیں۔ شاعروں کے علاوہ ادیبوں اور نثاروں میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ سرسید نے بھی فارسی کے چند اشعار میں اپنی فنکارانہ عظمت پیش کی ہے۔ حالی کی بعض نظمیں نہایت تعلی آمیز ہیں حالانکہ وہ نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ مفاخرت اور انانیت ادب کے لئے باعثِ صد فخر و فیض ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے فکر و نظر کی اشاعت ہوتی ہے، تنقیدی پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور ادبی و شعری تخلیق میں وسعت اضافہ ہوتا ہے۔ انانیت پسند شاعر جب فخر کرتا ہے تو اس کے ہمعصر اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس طرح فکر و نظر کا ایک سلسلہ روشن ہو جاتا ہے۔ انیس و دبیر کی چشمک نے زبر دست شاعرانہ تخلیقات کو جنم دیا ہے اور وہ سب اسی انانیت کا عکس ہیں۔ شاعر اپنی انانیت پر فخر کرتا جاکر کرتا ہے اور کاوش و کاہش سے، خونِ جگر کی لالہ کاری سے فکر کے لئے آفاق پیش کرتا ہے۔

غالب کی نظم ونثر میں انانیت کو اہم مقام حاصل ہے۔ غالب
نے مختلف انداز سے اپنی عظمت کو نظم ونثر میں پیش کیا ہے۔ غالب
نے یہ کیفیت خطوط اور شاعری میں نہایت وضاحت اور تفصیل
کے ساتھ پیش کی ہے۔ اور اپنی شخصیت و اہمیت کو ابھارا ہے۔ اُردو
میں دو ادیب اس حیثیت سے ممتاز ہیں۔ ایک غالب اور دوسرے
مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا کی انانیت میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا مگر
غالب کی انانیت تضاد سے لبریز ہے۔ جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔
غالب کی انانیت کا اصل مرکز ان کی سخنوری ہے۔ لیکن بعد میں
ان کو نثر میں بھی اپنی عظمت کا احساس ہوگیا تھا۔ شاعری اور خطوط میں
بار بار اپنی انفرادیت کا اظہار کیا ہے۔ ان کی انانیت مختلف انداز
سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کی انانیت صرف ایک میدان میں
عظمت پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ وہ شجاعت اور جنگجوئی پر بھی فخر
کرتے ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

بعض خطوط میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات بیان کرتے ہوئے
فوجی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

ادب زندگی کا عکس ہوتا ہے کسی نہ کسی شکل میں غالب کی
زندگی میں انانیت کا وجود بھرپور انداز سے ملتا ہے۔ اس سلسلے
میں ان کی زندگی کے دو واقعات قابلِ ذکر ہیں :-
ایک بار دلی کالج میں فارسی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی، غالب
بحیثیت امیدوار وہاں گئے۔ اپنی پالکی میں بیٹھ کر پہنچے انٹرویو کے لئے۔ اور
انتظار کرنے لگے کہ صاحب آکر میرا استقبال کریں کیوں صاحب
اس سے پہلے آکر ان کا استقبال کیا کرتے تھے۔ غالب نے بہت دیر
انتظار کرنے کے بعد چپراسی کو بھیج کر کہلوایا کہ آخر وہ کیوں نہیں
آئے۔ تب پرنسپل صاحب اُن سے آکر ملے اور کہا کہ آج آپ اپنی
غرض سے آئے ہیں اس لئے میں آپ کا استقبال نہیں کروں گا۔ البتہ
جب آپ دربار میں ملیں گے تو میں ضرور آپ کو پہلے کی طرح وہی عزت
دوں گا۔ غالب نے کہا صاحب میں تو عزت کے لئے نوکری کرنے
آیا تھا۔ اب جبکہ نوکری سے عزت کم ہوتی ہے تو کیا فائدہ۔ یہ کہکر
وہ اپنے گھر آرہے، یہ طرزِ فکر ان کی انانیت کا واضح ثبوت ہے،
دوسرا واقعہ جوئے بازی کا ہے۔ ایک کوتوال نے (جس کو غالب سے
عداوت تھی) ان کو اس جرم میں گرفتار کرکے اُن پر مقدمہ چلادیا۔
اور انہیں دو ماہ کی سزا ہوگئی، اس پر جو خطوط انھوں نے
لکھے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ نے ان کی انانیت
پر ضرب لگائی ہے۔

غالب اپنے آپ کو سارے شعراء سے ممتاز اور یگانۂ
اسلوب کا حامل سمجھتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دُنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

کہتے ہیں صنفِ غزل کی وسعت میرے بیان کے لئے
ناکافی ہے ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دعوے کرتے ہیں کہ میری شاعری میں عیب کا کوئی
پہلو نہیں اور میری شاعری پر کوئی انگلی نہیں رکھ سکتا ؎

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت

کہتے ہیں مرے اشعار میں دل سوزی ہے اور اسی لئے پُر اثر
ہے۔ بلا اثر کے شاعری ہی کیا ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

وہ اپنے قلم کی آتش فشانیوں کا ذکر ایک اور طرح سے بھی کرتے ہیں ؂

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

غالبؔ کی انانیت غیر معمولی انداز سے ان کے کلام میں موجود ہے وہ اپنے اشعار کے مضامین پر بھی فخر کرتے ہیں ؂

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

وہ کبھی اس پر فخر کرتے ہیں کہ عوام مرے کلام کو آسانی سے سمجھنے سے قاصر ہیں ؂

از خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اُن کی انانیت اسی پر بس نہیں کرتی۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں ولی ہوں ؂

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

غالبؔ دنیا اور دنیا کی ہر چیز کو اپنے آگے ہیچ سمجھتے ہیں اور دنیا کو بچوں کا کھیل جانتے ہیں ؂

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ان تمام اشعار میں غالبؔ کی انانیت پوری طرح جلوہ گر ہے۔

خطوط میں بھی غالبؔ کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ اپنے طرزِ تحریر پر فخر کرتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ،

"مرزا صاحب میں نے وہ طرزِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

خطوط میں کہیں کہیں انھوں نے اپنی شخصیت کو خوب اُچھالا ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"مجھے نواب لکھا کرو۔ بہت سے انگریز بھی مجھے نواب لکھتے ہیں۔"

اس طرح گویا ان کی انانیت کو ایک تسکین ملتی ہے۔

ایک اور خط میں لکھتے ہیں کہ :-

مرا نام اتنا مشہور ہے کہ تم صرف میرا نام اور شہر دلی لکھ دیا کرو، خط مجھے مل جائے گا۔ اس طرح ان کی انانیت اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔

ایک طرف تو غالبؔ اپنے کو سب سے بڑا شاعر سمجھتے، ولی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اور اپنے اشعار کے مضامین پر بھی فخر کرتے ہیں، دوسری طرف وہ جہاں جھکتے ہیں خوشامد کرتے ہیں۔ اپنی حقارت کا بیان کرتے ہیں۔ اگر وہ قانع اور غیور رہتے تو نواب رامپور کو جو خط انھوں نے لکھے ہیں ان میں اپنی خودداری اور انانیت کو نقشِ ونگارِ طاقِ نسیاں نہ بناتے ہیں وہ پیسوں کی خاطر اپنی شخصیت کو بہت گرا کر پیش کرتے ہیں اور کہیں کہیں ان پر گداگروں کا شبہ ہونے لگتا ہے، بہادر شاہ ظفر کو لکھتے ہیں ؂ (رباعی صفحہ ۱۱۹ پر دیکھئے)

غالب طاؤس و رباب کے دور میں پیدا ہوئے ۔۔۔
طاؤس و رباب کے دور کی شاعری میں غمِ عشق کو محور کی حیثیت
حاصل ہوتی ہے ۔ غمِ روزگار اُس کے موضوع سے خارج ہوتا
ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ غالب ۔ ۔ ۔ ۔ کے زمانے کے دوسرے
شعراء مثلاً مومن ، ذوق و شیفتہ وغیرہ کا کلام غمِ روزگار سے
تقریباً خالی ہے اور ظاہر ہے کہ جس فن میں غمِ روزگار نہیں
ہو گا اُس میں کوئی پیغام بھی نہیں ملے گا ۔ لیکن غالب کے کلام کے
مُطالعہ سے جہاں ہم یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اپنے پُر شکوہ اندازِ
بیان ، ندرتِ خیال اور قدرتِ بیان کے لحاظ سے وہ ایک
منفرد شاعر ہیں وہاں ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ غمِ عشق
کے علاوہ غمِ روزگار کے بھی نقیب ہیں ۔ یہ البتہ درست ہے
کہ زندگی کے مسائل سے بحث کرتے وقت ، وہ ایک معلم یا
واعظ کا سا انداز اختیار نہیں کرتے ۔ اُنہیں اپنی رند مشربی اور
بادہ خواری کا بخوبی احساس ہے اور اخلاق و معاشرت یا زندگی
کے کسی اور مسئلہ پہ اظہارِ خیال کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں ،
بالواسطہ بھی اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے اُس میں اشارے ، کنائے
سے کام لیا ہے ۔ یا پھر اپنے کسی تجربہ کو اس پیرایہ میں بیان کر دیا
ہے کہ ہم خود بخود اس سے کوئی پیغام یا سبق حاصل کر سکتے
ہیں ۔ یہ دعویٰ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ طریقِ بیان
نفسیاتِ انسانی کے عین مطابق ہے اور بدرجۂ نہایت مؤثر بھی
ہے ،

حیات و کائنات کے مختلف حقائق کی ترجمانی کو غالب
کی شاعری میں نمایاں مقام حاصل ہے ۔ اگر یہی موضوع ہے جس
کی ترجمانی نے ان کی شاعری کو عظمت سے ہمکنار کیا ہے ۔ حسن و عشق
کے معاملات و مسائل کو بھی وہ حیات و کائنات سے الگ کر کے
نہیں دیکھتے ۔ بلکہ انہیں کا ایک بنیادی جزو سمجھتے ہیں ۔ اور زندگی
کے ایک بنیادی جُز کی حیثیت سے اُن کے بارے میں سوچتے اور
غور کرتے ہیں ۔ پھر اُن کی نگاہ تفکر اس حقیقت کی بھی جستجو کرتی
ہے کہ خود زندگی کیا ہے ؟ اس زندگی میں انسان کی کیا حیثیت
ہے ؟ اور پھر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زندگی بے ثبات ہے ۔ انسان
بے بنیاد ہے ، اس کی حیثیت اس نظامِ حیات میں ایک مجبورِ محض
کی ہے اور اس کا وجود زبانِ حال سے اس بات کا شکوہ سنج ہے ۔
زندگی میں غم کی حیثیت مستقل اور مسلسل ہے ۔ وہ کبھی ختم نہیں ہوتا
انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے باوجود زندہ

رہنے کی کوشش کرتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ ہر انسان کو زندگی
کے ہر دور میں ان حقائق کا احساس رہا ہے اور رہتی دنیا تک رہے
گا۔ غالب نے ان حقائق کی ترجمانی بڑے ہی مفکرانہ انداز میں
کی ہے ؎

نقشِ فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غالب
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ازل سے انسان انہیں حالات کا شکار ہے۔ زندگی کے سفر میں قدم قدم پر ایسی منزلیں آتی ہیں جب اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی ہستی بے ثبات ہے۔ ہر خوشی پر غم کا سایہ منڈلاتا رہتا ہے۔ تغیر کا خیال اور فنا کا احساس اس کو زندگی کی بے ثباتی کا احساس دلاتا رہتا ہے اور وہ اُن کو دیکھ کر اپنے دل و جگر کو خون کرتا رہتا ہے۔ غالب نے مختلف زاویوں سے ان حقائق پر اپنی شاعری میں روشنی ڈالی ہے۔

غالب نے اپنے دور میں بہت کچھ دیکھا اور زندگی کے بہت سے مظاہر کا مشاہدہ کیا، مگر وہ صرف اس دور کے تقاضوں تک محدود نہیں رہے بلکہ اُن کی وسعتِ نگاہ بہت دور تک محیط رہی۔ اس ہمہ گیری کا باعث صرف یہ ہے کہ غالب نے اپنے زمانہ میں زمانۂ مستقبل کی شاعری کی ہے۔ انھوں نے زندگی کو شعر میں سمونے کے لئے جن چیزوں کا سہارا لیا۔ ان میں سب سے زیادہ فکر اور عقل کی روشنی کا حصہ ہے۔ فکر و عقل کے امتزاج سے جو چیز پیدا ہوتی ہے اس کو فلسفہ کہتے ہیں اور فلسفہ ہی دراصل غالب کی شاعری کی اساس ہے۔

غالب کی شاعری کا بیشتر حصہ فکر اور عقل کے امتزاج سے مرتب ہوا ہے۔ یہی فلسفہ نفسیات کی عملی اظہار کے بہت قریب بھی ہے۔ غالب نے جہاں "باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا" کہہ کر سائنس کے ایک اہم اصول کی طرف اشارہ کیا وہاں انھوں نے زندگی کی نفسیاتی حقیقتوں کو بھی آشکار کیا ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

جیمز لینگے کا نظریہ یہ ہے کہ شعوری جذبات کا اظہار ہی ان کی تحلیل کا باعث ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب ہم ڈرتے ہیں تو کانپتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کانپتے ہیں تو ڈر بھی محسوس کرتے ہیں۔ یہی بات غالب کے یہاں ایک نئے تیور سے آتی ہے ؎

پاتے ہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

غالب کے یہاں رجائیت یعنی امید پسندی کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ وہ عام طور پر زندگی کے روشن پہلو کی طرف نگاہ رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی سے امید سلب کرلی جائے تو انسان کی اولوالعزمی اور سچائی جیسے اوصاف خود بخود ختم ہو جائیں۔ ایک دانشمندانہ کہاوت ہے کہ ہر چمکنے والی بجلی گرتی نہیں اور گرے بھی تو لازم نہیں کہ ہمیں پر گر پڑے غالب کا اندازِ فکر بھی یہی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر،

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب کے یہاں جو تیز و تند لہجہ پایا جاتا ہے وہ جوشِ زندگی اور نشاطِ آرزو کی پیداوار ہے۔ وہ ایک ایسی شخصیت کے چشمہ ہائے باطن سے نمودار ہوا ہے جس کے نزدیک زندگی کی تڑپ اور زندگی کی آگ ہی وہ متاعِ گراں مایہ ہے جو لذت اور لذتِ ادراک دونوں کی بیک وقت امین اور سرمایہ دار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب ہمیں ہر کہیں اپنی طرزِ روش، اپنے لب و لہجہ سے ایک زمانہ شناس اور ایک دور میں مدبر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اُن کا عملی رجحان، ان کے خطوط کے واقعات اور نالوں سے ملتی جلتی وضعِ غم روزگار کی طرف اعتنا اور ذاتی و اجتماعی تجربات کا ہجوم ——— یہ سب ایک نہایت واقعیت پسند روح کی خبر دیتے ہیں۔

شاھد احمد بی اے آنرز II ایر

غالب اور بہادر شاہ ظفر

مرزا غالب بڑی رنگا رنگ شخصیت کے مالک تھے ان کی پوری شخصیت کا مطالعہ اپنے اندر ایک خاص کشش اور دلچسپی رکھتا ہے خاص طور پر ان کی زندگی کا وہ حصہ جو انھوں نے قلعۂ معلیٰ سے تعلق کے ساتھ گذارا قلعہ سے ان کے دُور اور نزدیک دونوں طرح کے تعلق نے ان کی شاعری، شعور اور شخصیت کو متاثر کیا ہے۔

مرزا کے بہت سے اشعار جو بظاہر عاشقانہ ہیں جب اُن کو قلعہ سے مرزا کے ذہنی تعلق اور ان کی مخصوص نفسیاتی کیفیت کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو معاملہ بالکل دوسرا نظر آتا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

ہے مجھکو تجھسے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

کیا اس کے پس منظر میں ذوق کی مقبولیت ابھر کر سامنے نہیں آتی جو قلعۂ معلیٰ اور ظفر کے دربار میں تھی اور اسی نسبت سے شہر میں بھی ان کی شاعری کا شہرہ تھا، غالب کے دوستوں کی زبان سے اس کا تذکرہ انہیں ضرور ناگوار گذرتا ہوگا۔

ایسے ہی کچھ شعر یہ بھی ہیں ؎

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

غزل کی شاعری میں چھپے ہوئے حقائق تک پہنچنے کے لئے تحول صورت کی بہت سی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے جس سے بالآخر بات کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے ؎

مطلب ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر ان کے بغیر

اور اس ضمن میں اس خیال کو بھی بے بنیاد قرار نہیں دیا جاسکتا کہ غالب نے یہ شعر

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ذوق پر طنز کرنے ہی کے لئے کہا تھا۔ ذوق سے غالب کی چشمک کی بڑی وجہ بھی ذوق کا قلعۂ معلیٰ اور دربار ظفر سے تعلق ہی تھا۔

غالب کے اردو دیوان میں صرف چار قصیدے ملتے ہیں ان میں سے دو قصیدے جو مضمونِ منقبت سے تعلق

رکھتے ہیں اُن کی شاعری کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں باقی دو قصیدے۔

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام

اور

صبح دم دروازۂ خاور کھلا

دربارِ ظفر یا قلعۂ معلّٰی ہی میں پیش کئے گئے تھے قلعۂ معلّٰی اور ظفر سے
چاہے غالب کو وہ عقیدت نہ ہو جو ذوق کو تھی لیکن قلعہ کی
تہذیبی اہمیت اور ادبی منزلت سے وہ واقف تھے اور اُسے دوسرے
اداروں کے مقابلہ میں اولیت کا درجہ دیتے تھے، چنانچہ ایک
خط میں لکھتے ہیں ۔

دہلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر تھی، قلعہ، چاندنی چوک
ہر روز مجمع بازار جامع مسجد کا۔۔۔۔۔۔

ظاہر ہے کہ یہاں قلعہ سے مراد قلعہ کے در و دیوار نہیں بلکہ اس
کے وہ مطارحے اور مشاعرے ہیں جو دہلی کی تہذیبی اور ادبی زندگی
میں ایک خاص اہمیت اختیار کر گئے تھے اور ظفر جن کے
لئے شمعِ انجمن کی حیثیت رکھتا تھا۔

اُردو میں غالب کا مدحیہ حصّہ دو قصیدوں اور دو ایک
غزلوں اور قطعوں میں شامل مدحیہ اشعار کو چھوڑتے ہوئے ظفر
اور قلعۂ معلّٰی ہی کے تعلق سے سامنے آیا ہے. یہاں اس کا موقع
نہیں ہے کہ اس مدحیہ حصّہ کی ادبی اہمیت اور شعری محاسن
پر گفتگو کی جائے مگر چند ایسے مدحیہ شعروں کی طرف توجہ
دلانا شاید بے محل نہ ہوگا ۔

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

غالب مرے کلام میں کیونکر نہ ہو مزا
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

پھر کچھ اس شان سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

یہ وہ بہاریہ غزل ہے جو بہادر شاہ کی صحت یابی کے جشن
کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔ اسی ضمن میں بعض شہزادوں کی
پیدائش پر بھی مدحیہ اور دعائیہ شعر اُن کی زبانِ قلم پر آگئے اور
ان کی غزلوں میں شامل ہو گئے ۔

خضر سلطان کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

غالب خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

اسی میں شکوہ شکایت کا یہ انداز بھی دیکھئے جس کو
شوخیٔ تحریر نے نقشِ فریادی بنا دیا ہے۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ
رتبہ میں مہر و ماہ سے کم تر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اسی وظیفہ اور نوکری کے سلسلہ میں غالب کا وہ مشہور
قطع وجود میں آیا جس کے یہ دو شعر ایک لطیفہ کا درجہ رکھتے
ہیں ؎

رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھکو دیکھو کہ ہوں بقید حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بادشاہ مرزا کے قدر دان تھے اس کا اندازہ سیم کے بیج
اور شاہ پسند دال کے تحفوں سے بھی ہوتا ہے جو بادشاہ نے
"اولوش" کے طور پر مرزا کو بھیجے اور جن کا شکریہ مرزا نے
اپنی ان رباعیوں میں ادا کیا ہے

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

بھیجی ہے جو مجھکو شاہ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال ہے بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

قلعۂ معلّٰی کے تعلق ہی کی وجہ سے غالب اپنی اردو شاعری
پر توجہ دینے پر مجبور ہوئے۔ جب وہ قلعہ میں جاتے تھے تو بادشاہ
ان سے سوغات طلب کرتے تھے یعنی ان کا اردو کلام، قلعۂ معلّٰی
کی بزم سخن اور ظفر سے وابستگی ہی کی وجہ سے انھوں نے آسان
کہنے کی فرمائش کو قبول کیا، اور اپنی اردو شاعری کو سہل اور
آسان بنایا غالب کی اردو شاعری کا جو حصہ دہلی کی بولی ٹھولی
کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے وہ قلعہ اور ظفر کے اثرات
ہی کا بڑی حد تک مرہون منت ہے۔

ان کے اردو خطوط جنھوں نے اردو نثر کی تاریخ میں
ایک عہد آفریں کردار ادا کیا وہ قلعہ سے تعلق ہی کے نتیجہ
میں سامنے آئے۔

مرزا کا خطاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں
غالب عارف جنگ بہادر شاہ ظفر کے دربار ہی کا عطیہ ہے،
جس کے ساتھ انہیں دربار شاہی کی طرف سے تیموری خاندان
کی تاریخ لکھنے کا کام سپرد کیا گیا۔ اور چھ سو روپیہ سال ان
کا اس کے سلسلہ میں وظیفہ مقرر ہوا۔ جس کی خبر دیتے ہوئے
اسعد الاخبار آگرہ نے اپنی ۵ ار جولائی کی اشاعت میں
لکھا تھا،

> ان دنوں شاہ دین پناہ نے جناب معلّٰی القاب،
> مرزا اسد اللہ خان غالب کو بفرط عنایت اپنے
> حضور طلب کرکے ایک کتاب تواریخ کے لکھنے
> پر جو تیمور کے زمانے سے سلطنت حال تک
> ہو مامور کیا پھر اس کے کاتبوں کے خرچ کو
> بالفعل پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر کرکے آئندہ
> انواع پرورش کا متوقع کیا ...... چھ پارچہ
> کا بیش بہا خلعت اور تین رقم جواہر عطا فرمائے[1]

"مہر نیم روز" کی تصنیف سے مرزا دو سال میں فارغ
ہو گئے لیکن غدر سے پہلے ماہ نیم ماہ، اس تاریخ کا دوسرا
حصہ نہ لکھ سکے اس کے بعد لکھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس
لئے کہ اس ہنگامۂ رستاخیز میں خود مغل حکومت کا نام و نشان
مٹ گیا۔ البتہ ۱۸۵۴ء میں ذوق کی وفات کے بعد
مرزا بہادر شاہ ظفر کے استاد شاعری بھی بن گئے تھے جو کچھ نہ

---

[1] غالب نامہ شیخ محمد اکرام ص ۱۱۶

ہوتے ہوئے بھی اس دور میں ایک بڑا اعزاز تھا۔

غالب اور ظفر کے باہمی تعلقات میں دربار شاہی سے باقاعدہ وابستگی اور قلعۂ معلٰی اور دربار ظفر سے تعلق کے بعد ایک بار ایسا بھی ہوا غالب اور شاہ ظفر کے مابین شکر رنجی کی سی ایک صورت پیدا ہوگئی ورنہ ذوق سے محبت اور ہمدردی رکھنے کے باوجود بہادر شاہ اپنی مقدرت کے مطابق غالب کی قدر و منزلت کرتے رہے۔

جیسا کہ آب حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے شہزادۂ والا گہر مرزا جواں بخت کی شادی پر نواب زینت محل کی فرمائش سے مرزا غالب نے ایک سہرا لکھا اور سونے کی کشتی میں سجا کر اسے بارگاہ شاہی میں نذر گزرانا یہ موقع خوشی اور مسرت کا تھا لیکن اس مقطع کو دیکھ کر بادشاہ کو خیال ہوا کہ اس میں روئے سخن استاد شاہ یعنی ذوق کی طرف ہے ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بڑھکر سہرا

جب ذوق دربار شاہی میں آئے تو بادشاہ نے سہرا ان کو دکھلایا اور ان سے اس کے جواب میں سہرا کہنے کی فرمائش کی اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ مقطع پر نظر رکھیں جس کا اندازہ ذوق کے مقطع سے بھی ہوتا ہے ؎

جس کو دعوئے سخن ہو یہ سنا دے اس کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

غالب تاڑ گئے کہ بات بگڑ گئی فوراً قطعہ معذرت لکھا مگر اس میں بھی سخن گسترانہ باتیں کہنے سے باز نہیں رہے ؎

منظور ہے گذارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کیا مجال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

غدر کے بعد قلعۂ معلٰی کی شاہی سلطنت کی بساط ہی اُلٹ گئی اور اسی کے ساتھ آمدنی کا وہ سلسلہ بھی ختم ہوا جو قلعہ کے تعلق سے تھا لیکن قلعہ کا تعلق غدر کے بعد مرزا کے لئے گوناگوں مصائب و مشکلات کا سبب بن گیا، ملازمان قلعہ پر جو شدت تھی اس کا شکار غالب کو بھی ہونا پڑا، سرکاری وظیفہ بند اور دربار موقوف ہوگیا اور پھر کئی سال بعد بڑی مشکلات اور کاوش کے بعد جاری ہو سکا۔ اس اعتبار سے قلعہ اور ظفر سے غالب کا تعلق ان کی زندگی کا ایک اہم باب ہے جس کی تفصیلات پیش کرنے کا یہاں موقع نہیں،

سید ضمیر حسن

خط لکھیں گے

گرچہ مطلب کچھ نہ ہو

ہر چند قاعدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد جسے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل ہو وہ بڑا اور عظیم انسان سمجھا جاوے لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ جس نے مرے پیچھے شہرت پائی، ذلت اور خواری اُٹھائی چنانچہ پندرھویں فروری ۱۸۶۹ء کو ایک تیسرا جنم غالب کو ملا۔ خدا جانے یہ ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد تھی یا رضواں سے لڑائی کا نتیجہ۔ بہرکیف اِس عالمِ ارواح کے گناہگار کو ایک بار پھر عالمِ آب و گِل میں روبکاری کے لئے بھیجا گیا۔ دوسرے جنم میں ہی دوست، احباب، مونس، غم خوار، ہم سخن و ہم زبان نہ رہے تھے، تیسرے جنم میں تو کوئی صورت آشنا تک نہ ملا۔ میر مہدی مجروح و ہر گوپال تفتہ کہاں، نظام الدین ممنون و آزردہ کہاں، مومن خاں مومن و شیفتہ کہاں، نہ وہ بلیماران کی حویلی کہ دیوان خانے میں بیٹھے دوستوں کی راہ تکا کیجئے۔ وہ میر مہدی آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن صاحب آئے۔ نہ قلعے کے مشاعرے، نہ ذوق سے چشمکیں، نہ شبِ ماہتاب میں پچھلے پہر تک شغلِ ناؤنوش، لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ قاسم جان کی گلی، رائے مان کا کوچہ، قابلِ عطار کا کوچہ، نیل کا کٹڑہ سب کے نام موجود لیکن والے معدوم، جو لوگ اس ہیچ پوچ، بوڑھے اپاہج، آنکھوں سے اندھے، کانوں سے بہرے، ناتواں نیم جان، خلق کے مردود، خدا کے مقہور نکبت میں گرفتار رہینِ رنج و آزار غالب کو پہچانتے تھے ان میں سے ایک نہ رہا، ہائے ہائے لسان الغیب نے کیا خوب پیشگوئی کی تھی ؎

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

یہ لوگ جو غالب غالب پکارتے ہیں۔ ایک طرح کے بت پرست ہیں۔ وائے محرومئ قسمت کہ ان کی نگاہِ حقیقت ناشناس نے اپنی تسکینِ خاطر و ذوقِ بادیہ پیمائی کے لئے عافیت کے دشمن، آوارگی کے آشنا، بے جان و بے قالب اسد اللہ خاں غالب کو تاکا ہے۔ انہیں کبھی یہ شکایت تھی کہ نظم و نثر ایثارِ کرم کے جو ودائع خالق نے ان کی سرشت میں ودیعت کئے تھے ان کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا آپ ہی سمجھا۔ ہاں اگر کچھ داد ملی تو روح القدس سے ملی سو وہ ان کا ہم زبان نہیں۔ نہ سخنوری نہ سخندانی کس برتے پہ تتا پانی، لیجئے سلجوقی و افراسیابی۔ ایرانی نژاد، فارسی داں، ریختہ گو، غزل کے استاد، یک فنے، یکتائے زمانہ، انانیت کے قصر میں رہنے والے ہنس ہنس کے ہم عصروں کو برا کہنے والے، اب تو جی خوش ہوا، آفریں آفریں کی صدا کانوں میں آئی، خوب واہ واہ ہوئی داد و تحسین کے ڈونگرے برسے۔ اجی حضرت چپ کیوں

ہو بچو لو لالو، کچھ تو اکٹھو، بولیں کیا، دوسروں کو نام معرتے تھے کہ بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا۔ اب جو خود دربار داری کرتے ہیں۔ آزادی، خودبینی و خودآرائی سب ختم ہوئی تو کس منہ سے بولیں، وہ جو دوسروں کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در در بھیک مانگے وہ یہ ہیں۔ اگلی سی جولانی طبیعت زبان کی تیزی و طراری، شگفتگی مزاج خیر سے اب کہاں، یہ بھی یاد نہ رہا کہ دو ہزار بیت کا ایک دیوان اُردو میں کہا تھا اور کچھ مکتوب اپنے شاگردوں، دوستوں، بزرگوں، اور احباب کو لکھے تھے سو بطور سند و شہادت آج تک موجود ہیں۔ بادشاہِ دہلی کے لئے سکہ کہنا اور بات ہے کہ کہا اور مکر گئے مگر یہ کئی ہزار ابیات فارسی کی اور اُردو کی غزلیں، قصیدے، مرثیہ۔ تقریظیں، تاریخ، تنقید، اور مکاتیب جو حضور کی مریرِ خامہ سے وجود میں آئے کاغذی پیرہن پہنے شوخیٔ تحریر کے فریادی ہیں انہیں کیونکر جھٹلایئے گا۔ یہ کہنے سے تو نجات ہونی نہیں کہ سٹیرا بہترا ہو گیا ہوں۔ اپنا کلام جو کچھ کہا تھا اب یاد نہیں، حافظہ باطل ہوا، ستر برس سے زیادہ عالمِ رنگ و بو میں رہا، کہاں تک جیوں گا۔ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

کیا خوب نواب الٰہی بخش معروف نے کہا ہے

ع آہ جی جاؤں نکل جائے اگر جان کہیں

یاد کیجئے آپ نے فرمایا تھا:۔

ع خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

سو یہ حسرتِ دیرینہ آپ کی اب پوری ہوئی راج گھاٹ جہاں آپ ایک بار میٹھے پانی کے کنویں کی تلاش میں گئے تھے اس سے کوئی سات آٹھ کوس اُدھر بستی جامعہ نگر ہے اور اس میں ایک ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے اسم بامسمیٰ، بس ابھی وہ یہ اب آپ دائم پڑے رہیں۔ اقامت جاودانی ہے اور اسی ایک طور زندگانی ہے،

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے، یہ بندۂ کمینہ ہمسایہ خدا ہے کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے، تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد، ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں، قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں،

ع کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

حضرت آداب۔ اجازت ہو تو کچھ حال اس دیارِ مردم آزار کا بھی لکھوں جہاں آپ نے قحطِ غم الفت کی بدولت بے رزق جینے کا ڈھب سیکھا تھا۔ مرزا صاحب آپ نے مراسلے کو مکالمہ بنایا تھا۔ میں نے اسے مکاشفہ بنا لیا ہے، ہزار کوس پہ بیٹھے بنگاہِ قلم نظارہ کیا کیجئے۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کیجئے چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا۔ قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جز میں کل، چاندنی چوک کو فرنگی مارکیٹ کھا گئی، جامع مسجد کی چوک ایک گلزار نشاط افزا ہوا چاہتی ہے، قلعہ آپ کے وقت سے کمپ ہے چھاؤنی ہے۔ جمنا کی سیر پہلے بیلے کا میلہ ہوتی پھر موقوف، البتہ پھول والوں کی سیر اب بھی ہوتی ہے۔ بجرے چھوٹتے ہیں۔ جہاز محل میں تماشے ہوتے ہیں جھرنوں میں کمائیاں ہوتی ہیں۔ جوگ مایا جی کے مندر اور قطب صاحبؒ کے مزار پہ پنکھے اور چادر بھی چڑھائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب عینیت ہے حقیقت نہیں۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے، چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے۔ خانہ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہائے دلی وائے دلی بھاڑ میں جائے دلی،

ہوا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

غلام ساقیٔ کوثر و بندۂ ابی طالب بہ الزام کفر و الحاد ہے اس کی شراب نوشی و نظر بازی کے چرچے کر کے زمانہ شاد و بامراد ہے۔ ایک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے، کے یاد کرنے والے مشکل سے چند ہوں گے، ابتدائے سنِ شباب میں جو ایک

درویش کامل نے نصیحت کی تھی کہ خوب کھائیے، پیو، عیش کرو مگر یاد رہے مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو اور اس نصیحت پر آپ کا عمل بھی رہا تھا۔ کبھی کسی ستم پیشہ ڈومنی کو مار رکھا کبھی کوئے ملامت ہی کو ہو آئے اس کا گھر گھر تذکرہ ہے عشقِ خانہ ویراں ساز، لذتِ ریش جگر، جاں بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن، دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر کہ منجملہ آشفتگانِ غالب سب نے بھلا دیا۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف، دِلّی کا مال و متاع جو کچھ تھا لُٹ کر پنجاب پہنچا۔ آپ کا سرمایۂ حیات پانی پت میں انصاریوں کے محلّے کے رہنے والے ایک شخص کے ہاتھ آیا اور آپ نے اسے بجل کیا تھا۔ وہ ایک پِنّارہ بن کر دِلّی لوٹا ہے، ایک آپ کی جان حزیں اور اس قدر رنج و آلام کی یورش، مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں؛ ایک لشکر اربابِ اقتدار کا، ایک ادب دوست حضرات کا، ایک لشکر شعرائے کرام کا، ایک لشکر گورے غیر ملکیوں کا اور ایک لشکر ان پنجاب کے تماشائیوں کا، ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے، مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے، پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، کس کے گھر جاتے گا سیلابِ بلا مرے بعد، شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک، میں کہتا ہوں بھائی میری کیفیت کا کاغذ الگ لکھ سو اس کی شنوائی نہیں ہوتی، توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے، وہ دن گئے جب تحسینِ ناشناس سے گھبرا کے آپ نے فرمایا تھا۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا، اب اپنا نام غلط سنیئے، اپنے اشعار غلط دیکھئے۔ سر پھوڑ دیجئے، ماتم کیجئے۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز، آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا، کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور، ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے ؎

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

اللہ اللہ انسان کے جوہرِ اصلی اور کمالِ واقعی سے سرتاسر انحراف کیا جائے، اور فروعاتِ کم مایہ کو ایک عالم سراہے، اس سے بڑھ کر ستم کیا ہو گا۔ شاہجہان آباد میں ریختہ کے استاد کا جشنِ صد سالہ ہو اور ریختہ خود شکست و ریخت سے دوچار رہے، یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے، لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں، یہ فلکِ پیر نے طرزِ ستم ایجاد کیا ہے، میاں ہم اچھے ہیں یا بُرے ہیں، جو کچھ ہیں کمیاب ہیں، نایاب ہیں، یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ، اب کچھ دن میں فسانہ ہو جائیں گے خدا جانے بُرے ہیں یا بھلے، صحبت مخالف ہے اگر گل ہیں تو گلخن میں اگر خس ہیں تو گلشن میں۔ میں ولی پوشیدہ اور کافر کھلے، آپ کو محض اہلِ بینش دگرہ کشائے عقدہ ہائے مشکل ہی نہیں جانتے بلکہ آپ کی بزرگی، برگزیدگی اور صفائے قلب کے بھی قائل ہیں۔ ہم میں اور آپ میں خلّت و صفوت باہمی ہے۔

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن، ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر، یہ ہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا، ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا، جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی؛ ماعرفناک حق معرفتک وما عبدناک حق عبادتک

ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

سنو صاحب ـــــ یاں والوں کی باتیں یاں والے جانیں، ہمیں ان سے کچھ سروکار نہیں، عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے، حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو،

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز، چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا۔ البتہ آرزو کرنا آئینِ بندگی کے خلاف نہیں میری آرزو یہ ہے کہ اب دُنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو کم از کم بقید ہوش نہ رہوں۔ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید، نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے۔ بھائی اس معرض میں میں بھی تیرا ہم طالع ہوں۔ عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ۔ غالب کو بُرا کیوں کہو اچھا مرے آگے،

ہے خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پُرزے،

ہم بیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا —
غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
رویئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

●

ایک خط

..... صاحب ....

..... یقین مانئے یہ ہفتہ بڑا ہی مبارک رہا اس ملک میں غالب کی صد سالہ برسی بڑے زور شور سے منائی جا رہی ہے ہندوستان کی طرح تو نہیں پر بساط سے کچھ زیادہ —— ہنگاموں کے سبب خاصی کمی رہی ورنہ ایک ہنگامہ ہوتا، لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن والوں نے تو حق ادا کر دیا پورے ہفتہ ٹیلی ویژن پر باقاعدہ غالب کا کلام سنتی رہی، ڈرامے دیکھتی رہی اچھے پروگرام تھے۔ دوسری مجلسوں میں شرکت کا موقع کم ملا —— پرسوں پاکستان کونسل میں ڈاکٹر وحید قریشی نے مقالہ پڑھا چند پڑھے لکھے لوگ جمع تھے اچھا سا اجتماع تھا، میں اس دوران سوچتی رہی کہ غالب کی عظمت کا کیا رنگ ہے، —— پھر نہ جانے کیوں مجھے اجمیر کا سفر یاد آ گیا —— وہاں کی خانقاہ دیکھی مندر دیکھے —— سونے چاندی سے مزین مورتیاں دیکھیں مرمریں فرش والے گھاٹ دیکھے —— پشکر جی گئی، جہاں گھاٹ پر گھنٹوں بیٹھی رہی پنڈت بتاتا رہا کہ کیا کچھ کرنا چاہیئے —— تب دور ایک معمولی سے مندر کی جھلک میں نے دیکھی —— پوچھا کہ وہ مندر کیسا ہے —— میں ذرا دیکھ آؤں پنڈت ایک دم بے قرار سا ہو گیا۔ "اجی آپ وہاں کہاں جائیں گی برہما جی کا مندر ہے یوں ہی سونا پڑا رہتا ہے نہ کوئی یاتری نہ کوئی دکشنا —— ہے پربھو —— کیا ہی سنسار کی ریت ہے —— ہنومان جی کا مندر جیسے سونے کا ڈلا —— دن بھر لنگر بٹتا ہے —— خواجہ کی چوکھٹ پر جو کوئی جلئے خالی ہاتھ نہیں لوٹتا —— پر یہ برہما جی —— ذاتِ واحد —— تن تنہا —— ٹھیک ہے، جب لاشریک ہوں تو یوں ہی رہنا ہے —— خوب ہے صاحب —— بیچارے میر خدائے سخن کی کبھی یہی صورت نظر آئی —— ورنہ ذوق اپنے زمانہ میں اور غالب بعد کے دور میں اچھا وقت پا گئے —— پر میر وہ تو خدائے سخن ہو گیا تھا، اور وہی آج تک ہے نہ عروج نہ زوال نہ کوئی اپنا نہ پرایا...... نہیں...... مجھے غالب پر رشک نہیں آیا اور نہ میر پر ترس —— بس کچھ یوں ہی اس ہنگامے اور اس شور و شغب میں یہ بات میرے ذہن میں آئی اور میں بے ساختہ آپ سے کہہ بیٹھی —— چلئے جانے دیجئے ....

رضیہ سلطانہ (راولپنڈی)

۱۷ ۲/۶۹

تنویر احمد علوی

کہتے ہیں جس کو عشق

محمد بخش مرزا غالب بڑے خوش طبع، خوش فکر، ظریف انسان تھے، اپنے کو بڑی چیز سمجھتے تھے اور آسانی سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے ان کی بلند خیالی فرشتوں کے بھی کان کترتی تھی، جنت کو وہ دل کے بہلانے کے لئے ایک اچھا خیال سمجھتے تھے اور اس خیال میں پڑے رہتے تھے۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
اپنی قسمت سے بھی حوریں اگر واں ہو گئیں

پھر بھی عشق کے ہاتھوں مجبور تھے اور ان کا خیال تھا کہ بے عشق عمر نہیں کٹ سکتی، بیچارے سچ مچ کا عشق کرنا چاہتے تھے مگر شریف آدمیوں کی طرح اگر کبھی محبوب سامنے بھی آتا تو اپنے اوپر رشک کرنے لگتے اور یہ حالت ہوتی

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ایسے ہلکے پھلکے عشق میں بھلا کیا برائی ہے مگر زمانے کا بُرا ہو کہ ہر بوالہوس نے حسن پرستی کو اپنا شعار بنا لیا تھا، اور "شیوۂ اہلِ نظر" کی آبرو خطرے میں پڑ گئی تھی اسی لئے ان کے عشق کو کوئی پوچھتا نہ تھا اور بیچارے یہ کہتے نظر آتے

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

محبوب ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تو وہ یہ سمجھتے کہ مجھے بے حوصلہ خیال کیا جا رہا ہے اور اس خیال سے ان کو بہت تکلیف ہوتی، اشاروں کنایوں سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتے

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

ایک بار چپکے سے پرچے پر لکھ کر اُسے دیا

جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

مگر کیا جانے کیسی بری گھڑی میں عشق کا آغاز ہوا تھا کہ محبوب کے دل پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا، اس کے مقابلہ میں رقیب کی طرف اس کی نظرِ عنایت تیز ہو گئی تو کسی سے کہلوا کے بھیجا۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دُکھ تری مژہ ہائے دراز کا

سچ تو یہ ہے کہ بیچارے مرزا غالب کو محبوب کی مژہ ہائے دراز کا اتنا دُکھ نہیں تھا جتنا سوئے غیر نگہ ہائے تیز تیز کو دیکھ کر ان کے دل پر تیر و نشتر چلتے تھے۔

ایک بار کسی دوست نے پوچھا کہیئے مرزا صاحب آپ کے کاروبارِ عشق کا کیا حال ہے۔ ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا۔

عشق میں بے داد رشک غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمار دوست

رقیبوں سے عشق میں سبھی کو واسطہ پڑتا ہے اور ایک بار تو یہ دیکھ کر مرزا کا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہوا۔

نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا

مگر معلوم نہیں وہ کس وقت کی بات ہو گی اور کیوں ہو گی ورنہ مرزا بیچارے تو اکثر یہ ہی دیکھتے۔

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اور دل مسوس کر رہ جاتے، کبھی عقل و عشق کی کشمکش کا شکار ہو جاتے اور یہ کہتے نظر آتے

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

لیکن ایک دن ان کی یہ غلط فہمی بھی دور ہو گئی، ویسے تو وہ رقیب کے ساتھ کبھی یک جا ہونا نہ چاہتے تھے اور دعوے سے یہ کہتے تھے

ہم ہوں گے وہ نہ ہوگا وہ ہوگا ہم نہ ہوں گے

لیکن ایک بار اس کی بزم ناز میں یہ یک جائی ہو گئی تو مرزا صاحب نے بات کا پہلو بدل کر اپنا مدعائے دلی حاصل کرنا چاہا

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اب کیا کرتے ہو قہر درویش بجان درویش۔ ایک دن مشاعرے میں محبوب کو مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا اور اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

اس پر بھی اس نے سنی ان سنی ایک کر دی تو چپکے چپکے یہ کہتے ہوئے واپس آئے۔

کون سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

اب یہ کیفیت تھی

واں وہ غرور عز و ناز یہاں یہ حجاب پاس وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ایک دن گلی کے موڑ پر ملاقات ہو گئی تو مرزا نے محبت آمیز شکوہ کیا ان کا خیال تھا کہ اور کچھ نہیں تو شرمندہ تو ہوگا۔ مگر اس نے بچارے مرزا کی رسوائی کا خیال بھی نہ کیا اور رقیب اور اس کے یار دوستوں کو اکٹھا کر لیا اور مرزا یہ کہتے رہ گئے۔

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا

اس کے بعد وہ محبوب سے زیادہ رقیبوں سے ڈرنے لگے اور یا تو کبھی یہ کہا کرتے تھے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

یا اب یہ حالت تھی ــــ

ہم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش
مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

ان کی شبہائے فراق اندیشہ ہائے دور و دراز میں گزرنے لگیں کبھی سوچتے اور دنیا کے خیال میں محبوب کو مخاطب کرتے

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

کبھی سوتے سوتے خواب میں بڑبڑاتے

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ رقیب کا خیال ان کو وصل میں بھی آ جاتا تھا تو جیسے اختلاج قلب ہو جاتا ہے

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

محبوب کو مرزا صاحب کی اس کمزوری کا حال معلوم ہو گیا تو اس نے حضرت کے ساتھ طرح طرح سے شوخیاں شروع کر دیں ایک دن مرزا نے بوسہ کو پوچھا تو دور سے غنچہ ناشگفتہ کو دکھا دیا۔ غیر کو بوسہ دینا اور مرزا سے صاف مکر جانا، آخر مرزا صاحب کو کہنا پڑا ۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

بہت حساس آدمی تھے محبوب کی ایک ایک بات بلائے جان معلوم ہوتی تھی

عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

محبوب دور رہتا تو انکا سینہ راز ہائے سینہ گداز کا دفینہ بن جاتا، ہوا کو سونگھتے اور پھولوں کی خوشبو سے شرماتے اور کہتے ۔

آنے لگی ہے نکہت گل سے حیا مجھے

اور جو کچھ دن بھر سوچتے رہتے وہی رات کو خواب میں دیکھتے ۔

غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے
گر حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

پھر ایک دن سوچا کہ یوں کام نہ چلے گا شرما حضوری میں زندگی گذارنے سے کیا حاصل، مغل بچے تھے ایک دن جرأت کر کے کہہ ہی دیا ۔

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایکدن

اس نے ہنس کر ٹال دیا، سرور کے عالم میں بہکی بہکی باتیں تو کرتے ہی تھے ایک دن نشہ میں چھیڑ ہی دیا۔ اب اس کا جو انجام ہوا وہ خود انہیں سے سنئے ۔

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

جب یوں بھی کام نہ چلا بلکہ اور بات بگڑ گئی تو ایک دن خط لکھا اور بڑی معصومیت سے اپنا کیس پیش کیا ۔

عشق مجھکو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر سے تجھکو محبت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

اب کوئی حضرت سے پوچھے کہ اگر یہی حضرت تسلیم و رضا تھی تو پھر یہ کاہے کو کہتے تھے ۔

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
دل یہ کہتا ہے کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

خط لکھ دیا قاصد کو سونپ بھی دیا مگر اب اسے جانے نہیں دے رہے ہیں ساتھ ساتھ چلے جا رہے ہیں شاید اپنا خط قاصد کے بہانے خود ہی پہنچانے کی فکر میں ہیں ـــــ خط معلوم نہیں کیسے رقیبوں کے ہتھے چڑھ گیا کسی نے اس کی پشت پر مرزا ہی کا ایک شعر لکھ کر واپس کر دیا ۔

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

سمجھ گئے کہ معاملہ کیا ہے دوبارہ صاف صاف

شکوہ کیا ؎

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

اُسے جیسے مرزا صاحب سے کوئی دلچسپی نہ تھی اُس نے ستانا بھی چھوڑ دیا اس پر مرزا صاحب تلملا اُٹھے۔ اور اب کے یہ شعر لکھ کر بیرنگ خط بھیج دیا۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

مرزا صاحب جانتے تھے کہ یہ سب کچھ دشمنوں کی سازش کا نتیجہ ہے اس لئے بہانے بہانے سے ان کو جلی کٹی سُناتے رہتے تھے۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا

مزہ یہ ہے کہ رقیب کی بے حیتی اور محبوب کی شیریں دہنی کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک بار موقع دیکھ کر اُسے سمجھایا اور کہا

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

مگر وہ اس نازک بات کو کہاں سمجھنے والا تھا آخر کھلے لفظوں میں کہا لیکن محبوب پر جو اس کا اثر ہوا اس کی توقع مرزا صاحب کو ہرگز نہ تھی، اس لئے یہ کہتے نظر آئے ؎

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

مگر وہ عشق ہی کیا جس میں عاشق معشوق سے ہار مان جائے یہ تو اُن کو یقین ہو گیا کہ کامیابی تو ہونے سے رہی مگر چھیڑ خانی میں بھی تو ایک مزہ ہوتا ہے، ایک بار خط میں لکھا ؎

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

ایک بار بھیس بدل کر اور کان پر قلم رکھ کر نکل کھڑے ہوئے۔

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے

اس میں بھی کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تو سوچا چلو اس کے دروازے پر جا کر پڑ رہیں، دیدار بھی ہوتا رہے گا اور شاید اس طرح اس کے دل میں گھر کرنے کی بھی نوبت آ جائے محبوب نے شاید کسی کے کہنے سننے سے اجازت بھی دیدی مرزا غالب خوش خوش اپنا بستر باندھ وہاں پہنچ گئے کہ بس اب مر کر ہی وہاں سے اُٹھیں گے، مگر یار کی ستم ظریفی دیکھیے،

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کچھ دن نہ گئے، لیکن کب تک صبر کرتے، ایک دن فقیر کی طرح صدا لگاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ دربان نے سوچا کوئی مدلیو نہ گیا ہے مگر حضرت کی شامت جو آئی تو اس کے پیروں پر گر پڑے اس کے بعد جو کچھ ہوا یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ آئندہ اس کے کوچہ سے گذرتے بھی تھے تو سیاست دربان سے ڈرنے کی وجہ سے آواز تک نہ نکالتے تھے، پھر سوچا کہ یوں کب تک کام چلے گا، آپ ہی آپ یہ فیصلہ کر لیا ؎

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسبان اپنا

ایک دن راہ میں ملاقات ہو گئی موڈ اچھا تھا مرزا صاحب سے کہنے لگا اے حضرت آپ نے تو ہمیں بھلا ہی دیا۔ عرصہ سے آپ ادھر نہیں آئے، مرزا صاحب بے چارے خوشی سے پھولے نہ سمائے فوراً بولے ؎

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس دم
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اب مرزا صاحب روز منتظر رہنے لگے کہ اب ان کا آدمی آتا ہوگا، کل نہیں تو آج ضرور آئے گا۔ مگر ان کا آدمی نہ آنا تھا نہ آیا، عشق کی آنچ پہلے ہی تیز تھی اور ہجر کی آگ میں سلگتے سلگتے مرزا کا دل اب مجسم درد داغ بن گیا۔
جب راہِ عشق کے یہ مرحلے طے ہو گئے تو ایک دن توجہ تمام کے ساتھ یہ کہا

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اور واقعی وہ کچے دھاگے میں بندھا چلا آیا اب مرزا صاحب ہیں کہ سٹ پٹا رہے ہیں، کبھی اس کو کبھی اپنے گھر کو دیکھ رہے ہیں جس میں آج بوریا بھی نہ تھا۔ آئندہ کے لئے بلانے کا ارمان بھی نہ رہا۔
حضرت کو ذرا بھی ہوش ہوتا کچھ اچھے برے کا خیال کرتے تو آئندہ عشق کا نام نہ لیتے مگر کچھ ہی دن گذرے تھے کہ پھر وہی کوچہ گردی شروع ہو گئی۔

آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

اب ان کے دوستوں کو یقین ہو گیا کہ حضرت کو عشق نہیں وحشت ہے اور اس وحشت کا ایک ہی علاج ہے کہ انہیں قید میں ڈال دیا مرزا صاحب ان کی سعی چارہ گری پر قہقہے لگاتے تھے اور کہتے تھے۔

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

آخر ایک روز موقع پاکر قید سے نکل بھاگے اور مجنوں کی طرح صحرا نشین ہو گئے، مجنوں تو لیلےٰ لیلےٰ کہتا پھرتا تھا، حضرت شعر کہتے مگر انداز یہ ہوتا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی،

ایک شعر آپ بھی سن لیجئے۔

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

آخر ایک دن خیال آیا۔

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبال دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

یوں بھی انہیں دشت کو دیکھ کے گھر یاد آتا تھا، ایک رات اسی عالم میں خواب دیکھا ؂

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

گھر میں آکر دیکھا کہ واقعی بہار آئی ہوئی ہے دیوار و در پر سبزہ اگ رہا ہے اور دربان بچارہ صبح سے شام تک گھاس کھودتا ہے اور شام کو گھاس کی منڈی جاکر بیچ آتا ہے، آخر ایک دن ایک مخلص دوست کی یہ نصیحت کام کر گئی۔

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

اس سے پہلے ان کے کئی ایک دوستوں کی یہ کوشش کہ دونوں میں پھر سے صلح صفائی ہو جائے ناکام ہو چکی تھی اور وہ مرزا سے یہ کہہ چکے تھے،

اس انجمن ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے وہاں اور تری تقدیر کو رو آئے

اب انہیں ہوش آنے لگا تو محبوب کو بھی کچھ خیال آیا اور ایک دن آکر بڑی معصومیت سے پوچھا کہ آپ کو مجھ سے شکایت کیا ہے کچھ فرمائیے تو سہی،

مرزا بولے ؎

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو
حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے

جب اُسے معلوم ہوا کہ اصل شے اس دبی ہوئی آگ ہی میں کہیں ہے تو دستِ پناہ لے کر راکھ کریدنے لگا۔ ایسے میں مرزا صاحب کو کہنا پڑا ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

اتنے میں قریب سے بلبل کے گانے اور پھولوں کے قہقہہ لگانے کی آواز آئی، مرزا صاحب کے سر سے عشق کا بخار اُتر چکا تھا بے اختیار بول پڑے

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

اس پر انھوں نے خود زور کا قہقہہ لگایا تو آنکھ کھل گئی۔

بسلسلۂ صفحہ۱۲ غالب اپنی انانیت کے آئینے میں

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

غالب بحیثیت ایک ادیب کے اعلیٰ درجے و مرتبہ پر فائز بحیثیت انسان کے وہ ہرگز اس درجے کو نہیں پہنچے۔ جوا، شراب، بادشاہوں کی خوشامد، تملق یہ چند اخلاقی عیوب بھی اُن سے وابستہ ہیں اور خوشامد تو یقیناً انانیت کے خلاف ہے۔

بہر حال غالب کی انانیت ان کے عزائم، حوصلہ اور بلندیٔ فکر کی ترجمان ہے۔ ان کی انانیت کے بحرِ بیکراں کے لئے سفینہ درکار ہے۔ غالب کی شاعری بھی اُن کی انانیت سے پُر ہے اور اُن کے خطوط بھی اس کیفیت سے لبریز ہیں۔ انانیت کے تصور میں غالب کا ایک مصرعہ پیش کیا جاسکتا ہے ؎

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی

میں سمجھتا ہوں کہ جس قدر انسان کے عزائم بلند ہوں گے اُسی قدر اس کی انانیت واضح ہو گی، سوسائٹی میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنی حالت پہ قانع اور راضی برضا رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اعلیٰ مقاصد کے طلبگار ہیں، بلندیوں پر جان دینے والے ہیں اور زندگی میں عظمت حاصل کرنے کے شائق ہیں۔ غالب اس دوسرے طبقے سے تھے جو اپنی حالت پہ قانع نہیں ہوتا۔ جب عزائم بلند ہوں تو آدمی وسائل کی قلت کا شکار ہو جاتا ہے اور اسی صورت میں "خمارِ تشنہ کامی" پیدا ہوتا ہے اور انانیت اُبھرتی ہے، بکھرتی ہے اور پروان چڑھتی ہے اور یہ غالب کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرچشمہ ہے جو بار بار اُبھرتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی
ایم۔ اے۔ (سال اوّل)

تصوریہ

ہیں خواب میں ہنوز

۱۸۴۲ء میں دلی کالج کی خوش قسمتی نے اُردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کو اس کالج کا اُستاد بننے کا موقع دیا مگر اس وقت کے کالج کے سیکریٹری مسٹر ٹامسن کی نااہلیت اور اِس شاعر کی قدر سے ناواقفیت نے کالج کو اس کے استفادے سے محروم رکھا، کیونکہ دروازے پر اس کا استقبال نہ کرکے گویا اس کی بے حرمتی کی اور کالج کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بھی لگوادیا ——— اور اب ایک سو ستائیس سال گزر جانے کے بعد جبکہ یہ کلنک کالج کی تاریخی اور صاف وشفاف پیشانی پر چاند کے داغ کی طرح چمکنے لگا تو موجودہ پرنسپل صاحب نے اس کلنک کو مٹانے پر غور وخوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسٹر ٹامسن کے کردہ گناہ کا کفارہ ادا کردیا جائے۔

مرزا غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر کالج کی دونوں شفٹوں نے اپنے اُردو میگزین کو مرزا غالب کی طرف منسوب کرتے ہوئے "غالب نمبر" کا نام دیا ہے، اور ان کو لاثانی اور یادگار بنانے کے لئے نہایت محنت سے مضامین حاصل کئے ہیں ——— یوں تو اس گناہ کے لئے یہ کفارہ کم نہ تھا۔ لیکن پرنسپل صاحب چاہتے تھے کہ اس کلنک کو بالکل ہی ختم کردیا جائے اور اس کے لئے وہ کسی ایسے کام کے خواہشمند تھے جیسا آج تک نہ ہوا ہو اور نہ ہی ہونے کی توقع ہو۔

ہندوستانی فلمیں دیکھتے دیکھتے جس طرح آپ ناممکن کو ممکن اور مجبوری کو سچ دیکھنے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں اسی طرح آپ کو یہ مانتے ہوئے ذرا بھی جھجک نہیں ہونی چاہیئے کہ پرنسپل صاحب کی پریشانی اور بے چینی کو دیکھتے ہوئے اللہ میاں کو رحم آگیا اور فرشتوں کے ذریعے کہلایا "تمہاری پریشانی کا ایک ہی علاج ہے کہ تم اپنے کالج میں مرزا غالب کے اعزاز میں ایک غیر معمولی استقبالیہ دو۔ اس کے لئے ہم غالب کے جسم کو چند گھنٹوں کے لئے دنیا میں بھیج سکتے ہیں" ——— "وہ اندھا کیا چاہے .... " کے مصداق پرنسپل صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اگلے دن انھوں نے کالج کے دوسرے اساتذہ سے مشورہ کیا اور استقبالیہ کے لئے فروری ۶۹ء کی ۱۵ ار تاریخ طے کی گئی ——— غالب کی وفات کے پورے سو سال بعد کی تاریخ ——— اطلاع آئی " ۱۵ار فروری ۶۹ء بروز ہفتہ بوقت ساڑھے آٹھ بجے صبح غالب کا جسم اُن کے مزار واقع نظام الدین نئی دہلی سے نکل کر ایک بار پھر دلی کی تاریکی طرف نظام الدین سے اجمیری گیٹ تک کی سیر کرسکے گا اور کالج میں اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیہ کی تقریب میں شرکت

ر کے پورے بارہ گھنٹے بعد (یا اس سے پہلے اگر غالب چاہیں)
ساڑھے آٹھ بجے شب پھر مزار میں داخل کر دیا جائے گا۔"

اطلاع کے موصول ہوتے ہی کالج میں استقبالیہ کی تیاریاں
شروع ہو گئیں ـــــ اسٹاف کے تمام ممبر کام میں لگ گئے اور
تمام طلبہ خصوصاً اردو سے متعلق طلبہ اپنے لائق اور قابل اساتذہ
کا ہاتھ بٹانے کے لئے مستعد ہو گئے۔ وہ سب اس استقبالیہ
کو ایک لاثانی تقریب بنا دینا چاہتے تھے۔

جنگل کی آگ کی مانند تمام ملک میں یہ خبر پھیل گئی کہ غالب
دلی کالج میں آرہے ہیں ـــــ خبر کا پھیلنا تھا کہ کالج میں لوگوں
کا تانتا بندھ گیا۔ وہ سب یہ معلوم کرنے آتے "کیا یہ خبر
صحیح ہے ـــ کیا سچ مچ مرزا غالب آرہے ہیں ـــ؟" لوگوں
کی بھیڑ سے تنگ آکر کالج کا دروازہ بند کر دیا گیا اور وہاں پر
چپڑاسیوں کو بٹھا دیا گیا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کو داخل نہ ہونے
دیں کہ جس کے پاس کالج کا شناختی کارڈ نہ ہو ـــ مگر کچھ لوگ
ایسے آئے کہ جن کو روکنے کی ہمت چپڑاسیوں نے اپنے اندر
نہیں پائی ـــ بمبئی سے ایک پروڈیوسر صاحب بنفسِ
نفیس دلی آئے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس فنکشن
کو فلمانے کے حقوق لینا چاہتے ہیں اور اس کے بدلے وہ پچیس
ہزار روپے دینے کو تیار ہیں ـــ دوسرے آئے جنھوں
نے پچیس کو تیس کیا ـــ تیسرے نے پچاس اور اس طرح بڑھتے
بڑھتے یہ بولی ایک لاکھ پر جا کر رکی ـــ غالب اکیڈیمی کا
ایک وفد آیا اور اس نے اس فنکشن کو اپنے زیر اہتمام کرنے
کی پیشکش کی ـــ اندرون و بیرون ملک کے متعدد
رسالوں اور اخباروں کے نمائندے آئے کہ غالب کے بارہ
گھنٹے کے اس قیام میں ایک پریس کانفرنس کا بھی انتظام کیا جائے
ـــ روس اور پاکستان (جہاں غالب کی صد سالہ
برسی اسی زور شور سے منائی جا رہی ہے جیسی کہ خود ہندوستان
میں) نے کہلایا کہ وہ اس تقریب کے لئے پچاس پچاس ہزار روپے
عطیہ کے طور پر دینا چاہتے ہیں ـــ اتنی شہرت دیکھ کر ہندوستان
کی پارلیمنٹ نے ایک بل پاس کر کیا کہ "دلی کالج" کا نام بدل کر
"مرزا غالب اردو کالج" رکھ دیا جائے ـــ یونیورسٹی گرانٹس
کمیشن (U.G.C.) کے عملہ نے برسوں سے دبی اور خاک دھول
سے اٹی کالج کی عمارت سے متعلق فائل نکالی اور دو لاکھ روپے
کالج کی نئی عمارت کے لئے منظور کئے اور کالج سے ملحقہ ریلوے
کالونی کو ختم کرکے وہ جگہ کالج کو دے دئے جانے کا حکم دیا۔ دراصل
ان کو خطرہ تھا کہ کہیں فنکشن کے دوران کالج کی یہ شکستہ عمارت منہدم
نہ ہو جائے ـــ کئی ٹائر کمپنیوں نے پیشکش کی کہ جس گاڑی
میں غالب صاحب سفر کریں اس میں ان کے ٹائر لگوائیں۔

ان تمام پیشکشوں اور درخواستوں پہ غور کیا گیا اور پھر ان سب
کو جواب دیا گیا ـــ اس کو فلمانے کے متمنی اور عطیہ
دینے کے خواہشمندوں سے صاف صاف کہہ دیا گیا "یہ فنکشن ہم
اپنے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لئے کر رہے ہیں اور اس سے
ہمارا مقصد ہرگز ہرگز دولت بٹورنا یا شہرت حاصل کرنا نہیں
ہے۔ چونکہ یہ صرف ہم سے متعلق ہے اس لئے اگر ہم آپ کی پیشکش
قبول کرتے ہیں تو ہم کو خدشہ ہے کہ اللہ میاں ناراض ہو جائیں گے
اور غالب کو دنیا میں نہیں بھیجیں گے ـــ لہٰذا اس کے تمام
اخراجات ہم خود برداشت کریں گے اور کسی غیر سے نہ تو مدد
لیں گے نہ ہی اس کو فنکشن میں شریک کریں گے۔"

یہ جواب ان لوگوں کے لئے ٹکا سا جواب ثابت ہوا اور
وہ خاموش ہو رہے۔ روس اور پاکستان سے کہا گیا کہ وہ پچاس
ہزار روپے ہم کو دینے کی بجائے اپنے ہی ملک میں اردو کی فلاح و
بہبودی میں خرچ کر دیں ـــ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن
(U.G.C.) کو پیغام پہنچایا کہ ہم تیار ہیں اور جتنی جلدی ممکن ہو
سکے اپنا کام شروع کر دیں تاکہ اس وقت تک نئی عمارت بالکل

تیار ہو سکے۔ اور حکومت ہند کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے کالج کا نام بدلا اور درخواست کی کردہ کالج کا نام بجائے "مرزا غالب اُردو کالج" کے اس کا پرانا نام "اینگلو عربک کالج" رکھنے کی اجازت دے ——— ان کے جواب میں U.G.C نے کہا۔ چونکہ آپ فنکشن بڑے پیمانے پر نہیں کر رہے ہیں اور اس میں کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ کوئی بھی شرکت نہ کر سکے گا۔ اس لئے نئی عمارت کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس سے کسی اور کو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ (کوئی ان سے پوچھے اگر فنکشن بڑے پیمانے پر ہوتا تو کالج کی نئی عمارت سے اس کے طلبہ اور اساتذہ کے علاوہ کس کو فائدہ پہنچتا) ——— حکومت ہند نے اپنے جواب میں کہا، چونکہ فنکشن میں دوسرے لوگ خصوصاً دوسرے مُلکوں کے سفراء وغیرہ شرکت نہ کر سکیں گے اس لئے ہم ضروری نہیں سمجھتے کہ اس کا نام بدلا جائے ——— U.G.C. اور حکومت ہند کے حسب توقع جواب پانے کے بعد ٹائر کی کمپنیوں سے کہا گیا کہ آپ کی پیش کش زیرِ غور ہے۔

اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کالج کے اساتذہ و طلبہ پھر اس کی تیاری میں مصروف ہو گئے ——— فنکشن کا انتظام اور نوعیت طے کرنے کے لئے پرنسپل صاحب نے ایک جنرل باڈی کی میٹنگ بُلائی ——— میٹنگ میں یہ طے پایا کہ فنکشن نہایت سادہ اور کالج کے ہال میں ہوگا ——— سامعین کے لئے کُرسیوں کی بجائے فرش کا انتظام کیا جائے گا ——— اور ہال کے تھوڑے حصے پر پردہ ڈال دیا جائے گا اور اس کے پیچھے طالبات کے بیٹھنے کا انتظام ہوگا اور تمام اساتذہ و طلبہ کا لباس شیروانی اور پائجامہ ہوگا ——— یہ فیصلہ اس خطرے کے پیش نظر کیا گیا کہ کہیں مرزا غالب بے پردگی اور کوٹ پینٹ دیکھ کر برہم نہ ہوں اور یہ کفارہ بےکار ثابت ہو ——— اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کالج کے گیٹ پر کالج کا نام اُردو میں لکھوانے کا فیصلہ کیا گیا ——— اب سوال مرزا غالب کی سواری کا تھا کہ وہ نظام الدین سے کس سواری کے ذریعے لائے جائیں، آیا کار استعمال کی جائے یا کچھ اور ——— چونکہ شروع ہی سے اس بات کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ غالب جب دلی میں آئیں تو ان کے سامنے ہر چیز ویسی ہی ہو جیسی ان کے سامنے ہوتی تھی تاکہ وہ اجنبیت محسوس نہ کریں اور یہاں کی ترقی پذیر چیزوں کو دیکھ کر وہ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ "اللہ میاں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ کہا تھا دلی بھیجے جاؤ گے مگر بھیج دیا جانے کہاں ——— ہے" اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا غالب کو ٹمٹم میں لایا جائے گا کیونکہ ان کے سامنے ایک یہی سواری تھی اور وہ دلی کالج پہلے بھی اسی میں آئے تھے۔ لہٰذا ٹائر کی کمپنیوں سے معذرت چاہی گئی ———

جنوری کے مہینے نے اکتیس دن دُنیا پر راج کرنے کے بعد اُس ہندوستانی وزیر کی طرح گمنامی کا لبادہ پہن لیا جو الیکشن میں ہارنے کے بعد وزارت کی کرسی چھوڑ کر اسی لبادے کو زیب تن کر لیتا ہے ——— جنوری کے معزول ہونے کے بعد فروری نہایت آب و تاب سے برسرِ اقتدار آیا ——— اب فنکشن میں صرف پندرہ دن رہ گئے تھے۔

ہر طالب علم سے فنکشن کے لئے فیس کے ساتھ دس روپے لئے گئے۔ اور پیسے اکٹھا ہونے پر پروگرام کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا گیا۔ سب سے پہلے کالج کے گیٹ پر اُردو میں نام لکھ دیا گیا اور کالج ہال کو مغلیہ آرٹ کے تحت سجانا شروع کر دیا گیا ——— نظام الدین سے اجمیری گیٹ تک کے راستے میں جو ایسی دکانیں یا عمارتیں پڑتی تھیں جن پر اُردو کے علاوہ کسی اور زبان میں بورڈ لگا ہوا تھا تو ان کے مالکوں سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک دن کے لئے یا تو اپنے بورڈوں کو اتار لیں یا براہ مہربانی کپڑے پر اُردو میں لکھوا کر ان پر لگوا لیں ——— اگرچہ کالج سے غیر متعلقہ

لوگوں کو منع کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی لوگوں کے آنے کا خدشہ لاحق تھا اس لئے دلی پولیس سے مدد کی درخواست کی گئی ——— مرزا غالب کو لانے کے لئے ایک نہایت خوشنما ڈولی تیار کرائی گئی اور چار ماہر کہاروں کا انتظام کیا گیا ——— مرزا غالب کو چونکہ پورے بارہ گھنٹے رہنا تھا اس لئے صبح کو ان کے ناشتے اور دوپہر و شام کو ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا گیا ——— کھانے خالص مغلیہ ہوں اور برتن بھی کم و بیش ایسے ہی ہوں اس کا خاص اہتمام کیا گیا ——— کھانے کا انتظام گرلز کامن روم کے لان میں شامیانہ کے نیچے کیا گیا ———

ان ہی تیاریوں میں مصروف چودہ دن اس طرح گزر گئے جس طرح ایک طالب علم کے لئے تعلیمی سال اور کالج کے نوٹس بورڈ پر نوٹس لگا دیا گیا "مرزا غالب کے استقبالیہ تقریب میں شرکت کے لئے تمام طلبہ و طالبات کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ کل ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء صبح آٹھ بجے تک کالج ہال میں پہنچ جائیں ——— طلبہ شیروانی میں اور طالبات سفید لٹھے کے برقعے میں آئیں ———"

اگلے دن صبح ہی صبح کالج کے چند سرکردہ استاد اور طالب علم نظام الدین واقع مرزا غالب کے مزار پر پہنچ گئے۔ راستے میں خلاف توقع انھوں نے دیکھا کہ لوگ اس طرح سڑک کے دونوں جانب کھڑے ہیں جیسے وہ جشن جمہوریت کی پریڈ دیکھنے آئے ہوں ——— دلی پولیس کے مضبوط سپاہیوں نے لوگوں کے اس اژدہام کو قابو میں کیا ہوا ہے اور اس سڑک کا ٹریفک بھی بند کر دیا ہے ——— مرزا غالب کے باہر نکلنے کا وقت ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے تھا ——— آٹھ بجے تک ان لوگوں نے مزار کے اوپر کے حصہ کا پتھر ہٹا دیا کیونکہ نکلتے وقت مرزا غالب کے زخمی ہونے کا خطرہ تھا۔

آٹھ بجکر پندرہ منٹ پر ایک صاحب کو اچانک خیال آیا کہ مرزا غالب کے لئے کپڑے تو لئے ہی نہیں، کیونکہ اطلاع میں یہ صاف نہیں تھا کہ وہ مع لباس کے نکلیں گے یا بغیر لباس کے ——— سب پریشان ہو گئے مگر اتنے کم وقت میں کیا ہو سکتے تھے خاموش ہو رہے ——— خدا کی مہربانی شامل حال تھی ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے غالب مسکراتے ہوئے مزار سے باہر تشریف لائے ——— وہ اپنے پرانے لباس میں تھے ——— حسب پروگرام ان کو ڈولی میں بٹھا گیا اور پھر کہار اپنی منزل کی طرف چل پڑے ——— راستے میں ڈولی کے پٹ کھول دیئے گئے تھے تاکہ راستے میں کھڑے لوگ غالب کا دیدار کر سکیں۔

نظام الدین سے سندر نگر، متھرا روڈ، تلک برج، بہادر شاہ ظفر روڈ اور پنڈت جواہر لال نہرو روڈ ہوتا ہوا یہ مختصر سا قافلہ دلی کالج آ کر رک گیا ——— دروازے پر ہی پرنسپل صاحب اور دیگر اساتذہ شیروانیاں پہنے اور ہاتھوں میں ہار لئے ان کی آمد کے منتظر تھے ——— چند ہی لمحوں میں مرزا غالب کی گردن ہاروں سے لد گئی۔ مرزا غالب کو پھر گرلز کامن روم میں لے جایا گیا تاکہ ناشتہ کیا جا سکے۔

ناشتے سے فراغت کے بعد مرزا غالب بصد احترام ہال میں لائے گئے جہاں کہ فنکشن ہونے والا تھا ——— ہال کو اس خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ دیکھ کر بہادر شاہ ظفر مرحوم کے دیوان خاص کا شبہ ہوتا تھا ——— وہ پہلے ہی کالج کے طلبہ و طالبات سے بھرا تھا، تمام طلبہ شیروانیوں میں تھے اور طالبات پردے کے پیچھے عورت کی فطرت سے مجبور چہ میگوئیوں میں مصروف تھیں ——— پرنسپل صاحب اور دوسرے اساتذہ غالب کے ساتھ ہی اسٹیج پر بیٹھ گئے وہاں بھی کوئی کرسی نہیں

تلاوت کلام پاک سے پروگرام شروع ہوا، پھر پرنسپل صاحب نے استقبالیہ پڑھا جس میں انھوں نے مرزا

غالب کو دنیا میں بھیجنے پر اللہ میاں کا شکر ادا کیا اور مختصر الفاظ میں غالب سے پچھلی غلطی کی معافی مانگی ——— اس کے بعد چند طلبہ و طالبات نے غالب کی چند غزلوں کو اپنی میٹھی اور سُریلی آواز دے کر نہ صرف غالب کو محظوظ کیا بلکہ حیران و ششدر بھی کیا ——— پروگرام کے اختتام میں مرزا غالب سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے تاثرات سے حاضرین کو آگاہ کریں ——— مرزا غالب کھڑے ہوئے اور بآواز بلند بولے کیونکہ لاؤڈ اسپیکر نہیں تھا "کچھ دن قبل آسمان پر ایک افواہ اُڑی تھی کہ انسان چاند کے راستے وہاں پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے تو میں نے اس پر ذرا یقین نہیں کیا تھا کیونکہ یہ کام ناممکن ہے ——— لیکن جب آسمان سے آتے ہوئے راستے میں میں نے چند امریکیوں کو چاند کے گرد گھومتا دیکھا تو اس پر یقین کرنے کے لئے مجبور ہو گیا ——— سوچنے لگا میں دلی جا رہا ہوں پورے سو سال بعد ——— اس طویل عرصے میں میرے ہم وطن بھی ترقی کر کے نہ جانے کہاں تک پہنچ چکے ہوں گے اور دلی بھی اپنا رنگ بدل چکی ہوگی اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھکو ترقی پذیر دلی کو دیکھنے کا موقع دیا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد یہ دیکھ کر کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تم لوگ وہیں ہو جہاں آج سے ایک سو برس پہلے تھے۔ بہت دُکھ ہوا۔ اور اب میں یہاں ایک منٹ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا، اور اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی'

غالب کی گلیوں میں بسلسلہ صفحہ ۹۹

اچھی اچھی نظمیں اُنھوں نے لکھی ہیں مثلاً یہی ...... وہ ہے نا ...... ارے یہی دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ..... اور وہ موت کا ایک دن معین ہے۔ اور ہاں ... آماں کہہ رہی تھیں وہ یہیں ہماری گلی میں رہتے تھے۔

یہ ہے مرزا غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک اُن کی رہائش گاہ اور اس گلی کے نشیب و فراز کی مختصر سی داستان؛ جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی، سُنا ہے غالب کی اس صد سالہ برسی کے سلسلے میں اس کی صورت پھر بدلے گی؛ دیکھیں اس کی صورت نکھر کر کیسی سامنے آتی ہے۔

(میں نے یہ مضمون پروفیسر حمید احمد خاں کے مضمون کی طرز پر لکھا ہے اور کچھ معلومات بھی اسی سے لی ہیں۔ اس کے علاوہ اس سلسلے میں اپنے ساتھی اقبال حسن کا جو نواب خسرو مرزا سے میری ملاقات کرانے کے لئے کئی روز تک میرے ساتھ رہے اور نواب خسرو مرزا کا اور لکڑی کی ٹال کے مالک محمد ابراہیم صاحب کا مشکور ہوں جنھوں نے اس مضمون کے سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کیا۔)

شہزاد اختر

(مزاحیہ)

نامۂ غالب

[فکر تونسوی کے نام]

گوشۂ غالب
جنت نگاہ اسٹریٹ
شہر آرزو، فردوس

برخوردار میاں فکر تونسوی

جیتے رہو۔ بلکہ ہزار برس جیو تم کہوگے ہزار برس جی کر کیا کروں گا آخر ایک دن مروں گا۔ لے میاں مرنے سے وہ ڈرے جس نے جینے کا مزہ نہ چکھا ہو سبجے مجھے دیکھو کہ زندگی بھر مرنے کی راہ دیکھتا رہا ـــــ اب یہاں ہوں تو وہی اک کاخ سر بہ طوبیٰ کی شاخ چشم بد دور وہی اک حور ـــ پتہ نہیں کس کا شعر ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

بس یوں سمجھ لو کہ یہی بہشت ہے وہاں کے دوستوں میں یہاں ایک نہیں ملتا کوئی کہیں کوئی کہیں کل اتفاق سے وہی ظالم پانی پتی انصاریوں کے محلہ کا رہنے والا میرا میر مہدی آگیا ـــــ

حضرت آداب آ! آ! میرا پیارا میر مہدی آیا آؤ بھئی ادھر آؤ کیسے مزاج ہیں میر مہدی کیا پوچھتے ہو بہر حال ہی گذر رہا کانوں سے جیسے بالکل سنائی نہیں دیتا...

ابھی کل کی بات ہے مفتی صدرالدین بہت دیر تک دروازہ پر دستک دیتے رہے، کلیان ڈیوڑھی پر رہتا ہے مگر وہ اس وقت ڈاک لینے گیا تھا، قریب کا کوئی بچہ کھیلتا ہوا ادھر آنکلا مفتی صاحب نے اسے میرے پاس بھیجا تب میں کھسکتا کھسکتا دروازہ تک اور ان کا استقبال کر کے انہیں اندر لایا بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں، میر مہدی کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اتنے میں کلیان ڈاک لے آیا اور پھر وہ تمہارا خط پڑھنے میں لگ گئے ـــــ کیوں بھئی کیا لکھا ہے حضرت اب خود ہی پڑھ لیجئے گا۔

میاں صاحب زادے خدا تمہیں خوش رکھے کہ تم نے مجھے یاد کیا ورنہ آج کل تو لوگ میرا جشن منانے میں اس طرح لگے ہوئے ہیں کہ خود مجھے بھی بھول گئے کہ میں کس حال میں ہوں کس خیال میں ہوں، بھئی یہ میرا جشن نہیں میرے نام کا جشن ہے اور اس میں میرے نام سے زیادہ ہر شخص کو اپنے اپنے نام کی پڑی ہے۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

سنا تھا اس میں بہت سے باہر کے ملکوں کے لوگ بھی آئیں گے اب یہ کہنا چاہئے کہ آئے تھے اس نے مقالہ پڑھا۔ اس نے مضمون لکھا، یہاں تقریری مباحثہ ہوا وہاں تحریری مقابلہ سب کچھ ہوا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اردو بے چاری آفت

کی ماری اب بھی اُسی کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ اتنے بڑے ملک میں جہاں سینکڑوں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمیوں نے میرا جشن منایا وہاں میری زبان کو کسی نے نہ پوچھا ——— اور کہیں کی بات جانے دو، دہلی میں بیٹھ کر جو لوگ میرا جشن منا رہے ہیں وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں کہ اُردو کو دہلی کی زبان مان لیں۔

میاں بڑا بننے کے لئے بڑے فریب کھانے پڑتے ہیں۔ یہی فریب مجھے بھی کھانے پڑ رہے ہیں۔ تم بھی کھاؤ اور دوسروں کے ساتھ مل کر مزے اڑاؤ۔ کیسی دلّی کہاں کی اُردو ———

میرے گھر ہی کا حال دیکھ لو۔ بلی ماروں کے محلہ میں مسجد کے قریب کوئلوں کی ٹال دیکھ لو۔ مسجد تو خیر دوبارہ بنا دی گئی مگر اُسی مسجد کے زیرِ سایہ میرا گھر! جس کو میں نے خرابات کہا تھا۔ اب یہ کہنا ہی مشکل ہے کہ میاں کبھی اس نام کی کوئی چیز تھی، دو چار ہی دن کی بات ہے کسی اخبار یا رسالہ جس میں اس کی تصویر نظر پڑی، بے اختیار مجھے رونا آیا ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

کبھی برسات میں دیکھو گے تو در و دیوار پر سبزہ اُگا ہوگا۔ اور یہ در و دیوار بھی خبر نہیں کب تک ہیں۔

بقول تمہارے سو برس بعد میری فاقہ مستی رنگ لا رہی ہے مگر اس رنگ میں بھی میری فاقہ مستی اسی طرح قائم ہے۔ میرے پڑوس میں میرے کچھ قرض خواہوں کو بھی جگہ مل گئی ہے۔ مرزا صاحب اب تو سو سال ہو گئے دیکھئے آپ کا جشن ہو رہا ہے لاکھوں خرچ ہو رہے ہیں مگر ہمارا نہ حساب نہ کتاب، اصل نہ سود، ہر ایک کے پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ اور چاٹو۔

صاحب زادے خدا کا شکر ہے کہ یہاں شراب طہور مفت ملتی ہے۔ کھانے پینے کا خرچ بھی داروغہ جنت کے ذمہ ہے ورنہ بہشت میں بھی بادیہ زادیہ اور سقر مقر کی... بات ہوتی اور سارے فرشتوں کا مقروض ہو چکا تھا، لال قلعہ کے مشاعرہ کا حال لکھو، سنا ہے بڑا شاندار مشاعرہ ہوا، جیسا کبھی پیر و مرشد حضرت ظل سبحانی کے زمانہ میں ہوتا تھا، مغل بادشاہ نے میری زبان کو نوازا اور مجھے شاہزادے یہ سب تم بھی جانتے ہو اب تمہاری حکومت نے مجھے نوازا مگر اُردو کو ....

ایک بار تو اپنے جشن میں شریک ہونے والوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار اپنا یہ مصرع یاد آ گیا ؎

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو

خبر نہیں ان جشن منانے والوں میں سے کسی کو یہ بھی سوجھتا ہے یا نہیں کہ جب اُردو ہی نہ رہے گی تو ان اخباروں، رسالوں اور کتابچوں کا کیا ہوگا جو میرے جشن کے موقع پر نکلے ہیں اور جب کوئی ان کتابوں ہی کو نہ پڑھ سکے گا اُردو کی الف، ب، ت ہی اس کی سمجھ میں نہ آئے گی تو میرا جشن منانے والوں کے نام ہی کون یاد رکھے گا۔

یہاں کا بھی عجیب حال ہے اُردو کو اگرچہ قومی زبان کی حیثیت سے باقی رکھا گیا ہے مگر سرکاری زبان کے طور پر عربی رائج ہے۔ یہاں بھی لوگ میرے معمولی شعروں کا مطلب پوچھتے نظر آتے ہیں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی ———

اپنے عقیدت مندوں سے نجات کا طالب

غالب

بزمِ ادب

۱۹۶۸ء—۶۹

اس سال بزم ادب دلی کالج دلی نے اپنا افتتاحیہ پروگرام ۲۱ ستمبر ۱۹۶۸ء تین بجے شام کالج ہال میں "یوم جگر" کی صورت میں پیش کیا ، صدارت کے فرائض عالی جناب محمد شفیع صاحب قریشی نائب وزیر تجارت حکومت ہند نے انجام دیئے ، جگر کی مختلف غزلیں ریڈیو آرٹسٹوں کے علاوہ کالج کے طلباء وطالبات نے ساز پر پیش کیں پھر غزل کے اختتام پر پس پردہ کمینٹری ہوتی رہی جس کے وسیلے سے جگر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی - آخر میں سمینار میں کالج کے طلباء وطالبات نے مختلف موضوعات پر مضامین ومقالے پڑھے اس میں سید ضمیر حسن لیکچرار شعبۂ اردو نے ایک مضمون "باتیں ہماریاں" کے عنوان سے پڑھا — ۱۰ اکتوبر کو بزم ادب کی پکنک تغلق آباد گئی ، ۷ نومبر کو ایک انٹر کلاس غزل سرائی کا مقابلہ ہوا جس میں گلزار احمد راجہ نے پہلا انعام پایا ، ۹ دسمبر کو کالج ہال میں ایک انٹر کالج بیت بازی کمپٹیشن ہوا جس میں دلی یونیورسٹی کے مختلف کالجوں نے حصہ لیا - شاہد احمد بی - اے آنرز سال دوم ، نے اوّل انعام حاصل کیا -

اس سال بزم ادب میں دو نئی ظرافیوں کا افتتاح عمل میں آیا ایک ٹرافی "میر تقی میر انٹر کالج غزل سرائی مقابلہ" کے نام سے وجود میں آئی جس کا افتتاح جناب موسوی صاحب پرنسپل دلی کالج دلی نے فرمایا اس پروگرام میں بہت سے کالجوں نے حصہ لیا - یہ ٹرافی اس سال جامعہ کالج نے حاصل کی — ۷ دسمبر ۱۹۶۸ء کو شام غزل منائی گئی جس کی صدارت اعجاز احمد صدیقی اڈیٹر ماہنامہ شاعر بمبئی نے فرمائی اس پروگرام میں جناب شمیم کرہانی ، جناب علیم اختر مظفر نگری سید غلام محمد سمنانی ، جناب جاوید وششٹ (صدر شعبۂ اردو دلی کالج) کے علاوہ اعجاز احمد صدیقی صاحب نے اپنا کلام سنایا ، ۱۲ دسمبر کو مختصر کہانی کا تحریری مقابلہ ہوا جس میں کالج کے طلباء وطالبات نے انعام حاصل کئے ، ۱۵ جنوری ۱۹۶۹ء کو تخلیقی سمینار کیا گیا جس میں ریحان الحق کو اوّل اور شاہد احمد کو دوئم انعامات دیئے گئے - بزم ادب کی جانب سے مختلف کالجوں کے پروگراموں میں دلی کالج سے ٹیمیں شرکت کے لئے بھیجی گئیں اور ہر کالج سے دلی کالج نے امتیازی انعامات حاصل کئے — بزم ادب نے غالب کی صد سالہ برسی پر "جشنِ غالب" منانے کا فیصلہ کیا - یہ جشن بزم ادب اور اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے مشترکہ طور پر ۲۰ فروری ۱۹۶۹ء

کو شام تین بجے کالج ہال میں منایا گیا "جشنِ غالب" کا افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر بوسانی (شعبۂ اسلامیات اٹلی) نے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا، بیگم صالحہ عابد حسین نے غالب پر ایک مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر جان مارک (چیکوسلاواکیہ) نے نہایت شستہ اردو میں تقریر کرتے ہوئے غالب کی شخصیت و شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا، بزمِ مشاعرہ میں محترم جاوید وششٹ، جناب شمیم کرہانی، جناب سید غلام محمد سمنانی اور غلام احمد فرقت کاکوروی نے اپنے کلام سے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بزمِ مشاعرہ کے صدر محترم مرزا محمود بیگ صاحب نے صدارتی تقریر میں غالب کی عظمت کو سراہا۔ آخر میں بزمِ موسیقی کا پروگرام شروع ہوا مختلف آرٹسٹوں کے علاوہ کالج کی طالبات نے غالب کی غزلیں ساز پر پیش کیں، بعد میں بزمِ موسیقی کے صدر محترم نواب خسرو مرزا نے غالب کو گلہائے عقیدت پیش کئے، نواب خسرو مرزا صاحب خاندانِ غالب کے ایک فرد ہیں۔ بزمِ موسیقی کے بعد ایک انٹر کالج بیت بازی مقابلہ ہوا، یہ مقابلہ بزمِ ادب کی ودیری ٹرافی عبدالمتین انٹر کالج بیت بازی ٹرافی کے سلسلے میں ہوا اِس ٹرافی کا افتتاح بیگم صالحہ عابد حسین نے فرمایا، عبدالمتین مرحوم ایک نہایت اچھے طالب علم تھے پچھلے سال ۴ر اگست کو ناگہاں ایک حادثے کے باعث ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئے ان کی موت کا غم اُن کے دوستوں اور کالج کے اساتذہ کے دل میں تازہ ہے۔ اُن کی یاد کو قائم رکھنے کے لئے اُن کے ایک عزیز دوست محمد نسیم صاحب نے جو دلّی کالج کے طالب ہیں یہ ٹرافی بزمِ ادب کو پیش کی۔ یہ ٹرافی جامعہ کالج نے حاصل کی، پہلا انعام شانِ حیدر طالب علم جامعہ کالج اور دوسرا انعام شاہد احمد طالب علم دِلّی کالج نے حاصل کیا ـــــــ

جشنِ غالب کے علاوہ، بزمِ ادب نے ایک انٹر کالج غالب انشا پردازی کا مقابلہ بھی رکھا جس میں مختلف کالجوں سے مضامین موصول ہوئے اس مقابلہ میں جامعہ کالج کے طالب علم سہیل احمد اور دِلّی کالج کے طالب علم محمد اقبال قریشی دونوں نے اوّل انعام حاصل کیا ـــــــ

(سکریٹری)

فکرِ نو

(فارسی)

جلد دوم سال ۱۹۶۸-۶۹

سرپرست

دکتر محمد مرسلین

مدیر

شاهد اقبال

برگزیده ای

از

مقاله

"غالب دهلوی و پیوندهای او با ایران"

نگارنده: سیّد عبدالقادر هاشمی

شاعر شیرین بیان و نویسندهٔ شیوا زبان میرزا اسدالله خان متخلص به غالب و اسد، مخاطب به نجم الدوله دبیرالملک[1]
مشهور به میرزا نوشه که در سال ۱۷۹۷ میلادی (۱۲۱۲ هـ - ق) در شهر آگره چشم به جهان گشود[2] و در روز دوشنبه
پانزدهم فوریه ۱۸۶۹ دار فانی را وداع گفت[3] و بقول میرمهدی مجروح:

رشک عرفی و فخر طالب مرد   اسدالله خان غالب مرد

امروزه شهرت او طبق پیش بینی خود او که گفت:

"شهرتِ شعرم بگیتی بعد من خواهد شدن"

در تمام جهان طنین افکنده و مراسم صدمین سالِ وفات او در تمام عالم برگزار می شود و از او تجلیل می شود.
غالب از زمان طفولیت و از هشت نُه سالگی بار دو شعری گفت[4] و از یازده سالگی شاعری فارسی را آغاز
نمود چنان که خودش در تقریظ کلیات نظم خود می نگارد:
"از روزیکه شمارهٔ سنین از آحاد فراز کرد برفت در رشته و حساب رحمت یازدهمین گره بخود برگرفت اندیشه
در روار (؟) و گام فراخ برداشت و کریوه مغاک بادیهٔ سخن پیمودن آغاز نهاد تا امروز که از هجرت خاتم الانبیاء
علیه التحیه والثناء یک هزار و دو صد و هشتاد و هشت گذشته و رصد نگار..... الخ"[5]
در اوایل شعر اردوی غالب رنگ فارسی داشت و خیلی زیاد تحت تاثیر مرزا عبدالقادر بیدل بود و تاثیر

---

۱ کلیات نثر غالب، مطبع نول کشور لکهنؤ ۱۲۸۷ هـ - ق، ص ۲۷۲

۲ » » » در تقریظ دیوان فارسی می نویسد: غالب چو ز ناسازی فرجام نصیب / هم بیم عدو دارم و هم ذوق حبیب
تاریخ ولادت من از عالم قدس / هم شورش شوق آمد و هم لفظ غریب
۱۲۱۲   ۱۲۱۲

۳ تمام تذکره نویسان چون حالی و مالک رام در یادگار غالب و ذکر غالب و دیگران همین تاریخ را نوشته اند و معتقدند

۴ یادگار غالب تالیف الطاف حسین حالی چاپ اله آباد ۱۹۵۸ ص ۲۵

۵ کلیات غالب (فارسی)، چاپ لاهور ۱۹۶۵

فارسی بقدری زیاد بود که گاهی غیر از فعل تمام کلمات و ساختمان شعری فارسی بود که حتی گاهی خود او آن ابیات اردو را از دیوان حذف نموده و به فارسی افزوده است مثلاً این بیت اردو:

کرے گر فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں — نہ نکلے خشت مثل استخوان بیرون ز قالب ہا

که همین بیت را خود غالب با اندک تغییری بفارسی نوشته و از دیوان اردو حذف نموده[1]:

کند گر فکر تعمیر خرابی هـای دل گردون — نیاید خشت مثل استخوان بیرون ز قالب ها

او ابیات زیادی دارد که می توان با اندک تغییر آن را بفارسی در آورد. در اینجا چند بیت بعنوان نمونه نقل می گردد:

شمار سبحه مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشای بیک کف بردن صد دل پسند آیا

ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل — کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا[2]

در ابیات مترلو را گر بجای آیا۔ آمد بنویسیم بفارسی در می آید و اما در این ابیات زیر غیر از ہے (هست) و کیا ہے (چیست) همه اش فارسی می باشد.

دل خون شدۂ کشمکش حسرت دیدار — آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے[3]

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ — ای نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے[4]

مستی بذوق غفلت ساقی ہلاک ہے — موج شراب یک مژۂ خوابناک ہے[5]

شبنم بگل لالہ نہ خالی ز ادا ہے — داغ دل بے درد نظرگاہ حیا ہے[6]

ذرہ ذرہ ساغر میخانۂ نیرنگ ہے — گردش مجنون بہ چشمک ہائے لیلی آشنا[7]

و ای بسا اشعار اردوی غالب که بجای خود فارسی است مثلاً:

سنگ آمد و سخت آمد درد سر خود داری — معذور سبکساری، مجبور گرانجانی[8]

غالب در شعر می خواست به تتبع و پیروی و تقلید بپردازد و اعتقاد داشت راه خود را به پیماید و از استعمال کلمات عامیانه سخت بیزار بود و چندین جا اشاره نموده است شاعری اردوی او مایۂ افتخار نیست و بنا به احتیاج و تقاضای روزگار بار دو شعر می سراید و در قطعه ای می گوید:

---

[1] یادگار غالب ص ۱۰۶ .

[2] و [3] و [4] و [5] و [6] و [7] و [8] دیوان غالب جدید المعروف به نسخۂ حمیدیه صفحات ۲۰۰، ۲۰۴، ۲۰۴، ۲۲۲ و ۲۰۶ و ۱۹

نیست نقصان یک دو جزو است از سواد ریخته   کان دژم برگی ز نخلستان منست
فارسی بین تا ببینی نقش های رنگ رنگ   بگزر از مجموعهٔ اردو که بی رنگ منست[1]

غالب در شبه قارهٔ هند و پاکستان برای اشعار اردو شهرت زیادی دارد ولی آثار فارسی او را چنان هم مانند اردو مورد بحث و مطالعه قرار نداده اند و نیز کسانی که از اشعار فارسی لذت ببرند و بهره مند شوند بسیار کم هستند غیر از اینکه بعنوان شاعر فارسی خیلی کمتر از آن است که بعنوان شاعر اردو زبان. در کشور های فارسی زبان نیز غالب را آنچنان که باید و شاید مورد مطالعه قرار نداده اند و مردم آن دیار نیز خیلی کم با او آشنائی دارند. در حالیکه غالب همانطور که خودش ادعا می نماید در واقع شاعر فارسی زبان بود و از نظر حجم و انواع شعری هر دو کلیات فارسی و اردو او را چه بسیاری است دارد و خیلی بیشتر از اشعار اردو می باشد. در اردو اغلب غزل دارد و از اصناف دیگر خیلی کم است در حالیکه در فارسی اصناف سخن مختلف و متعدد است و از غزل، رباعی، قطعه، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنوی و قصیده هر صنف را مورد استفاده قرار داده.

کلیات شعر غالب دارای ده هزار و چهار صد و بیست و چهار بیت است چنان که خودش در خاتمهٔ کلیات می نویسد:

"آن چه در این اوراق از قطعه و مثنوی و قصیده و غزل و رباعی فراهم آمده همگی ده هزار و چهار صد و بیست و چهار بیت است[2]" کلام فارسی غالب بیشتر در غزل و بعد بیشتر از دیگر انواع قصیده دارد. او در میان شاعران پیش از خود به ظهوری، عرفی، نظیری، طالب آملی، شیخ علی حزین، صائب، فیضی و بیدل وغیره توجه داشته چنان که خودش در نثر و نظم هر دو باین امر اشاره نموده[3].

غالب که در اوایل از بیدل و بعدها دیگر شعرای سبک هندی متاثر بوده یکی از بزرگ ترین شعرای شیوهٔ هندی است و بقول دکتر شفیعی کدکنی "بی گمان غالب بزرگ ترین سخنوری است که پس از عصر زندیه در شیوهٔ هندی غزل گفته است[4]"

غالب همیشه کوشش می نمود که در ادای معانی، تازگی داشته باشد و ابتکاری بخرج دهد و مثل دیگر شعرای سبک هندی از استعارات و تشبیهات تازه استفاده می نماید اما مثل اغلب شعرای این شیوه اشعارش را

---

[1] کلیات غالب (فارسی) ص ۲۶۷
[2] همان کلیات نظم، چاپ لاهور ص ۶۶۳
[3] برای سند رجوع شود به کلیات نثر ص ۶۸ و مقاطع غزل ها در صفحات ۶۴، ۶۹، ۶۶، ۷۰، ۱۲۱، ۱۲۱، ۱۳۰، ۱۴۵، ۱۵۲، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۴، ۱۸۴، ۱۸۴ و ۲۰۰ (کلیات نظم فارسی چاپ لکهنو)
[4] غالب دهلوی از دکتر شفیعی کدکنی، مجلهٔ هنر و مردم، چاپ تهران، شماره ۹۶ ص ۲۵

دور از فهم نمی سازد و تشبیهات و استعارات دور از ذهن را کمتر بکار می برد. یکی از مهم ترین محاسن کلام او چاشنی تصوف است که با شعارش بخشیده مثلاً این چند بیت غزل[1]:

خرابیم در رضایش در خرابی های ما باشد ‌ ‌ ‌ زچشم بد نگه دارد خدایا دوست کامان را ص ۵۷

ما همان عین خودیم اما خود از وهم دوئی ‌ ‌ ‌ در میان ما و غالب، ما و غالب حائل است ص ۷۳

هیچو رازی که بمستی ز دل آید بیرون ‌ ‌ ‌ در بهاران همه بوییت ز صبا می آید ص ۱۰۱

غالب دارای وسعت مشرب و آزادگی خاطر و رندی به تمام معنی بود:

رهروان چون گهر آبله پا بینند ‌ ‌ ‌ پای را پایه فراتر ز ثریا بینند ص ۵۵۷

. . . .

برسم و زمزم و قشقه و زنار و صلیب ‌ ‌ ‌ خرقه و سبحه و مسواک و مصلی بینند ص ۵۵۸

کیست در کعبه که رطلی ز نبیذم بخشد ‌ ‌ ‌ در گروگان طلبد جامهٔ احرامی هست ص ۸۵

نه گفته ای که بتلخی بساز و پند پذیر ‌ ‌ ‌ برو که بادهٔ ما تلخ تر از این پند است ص ۱۳۱

غالب در زندگانی اش مردی شوخ و بذله سنج بود و این امر در اشعار او هم پیدا است:

از حد گذشت شملهٔ دستار و ریش شیخ ‌ ‌ ‌ حیران این درازی یال و دم هما ص ۶

وداع و وصل جداگانه لذتی دارد ‌ ‌ ‌ هزار بار برو صد هزار بار بیا ص ۶

غالب تشبیهات تازه و زیبائی را بکار می برد:

بروی برگ گل تا قطرهٔ شبنم نپنداری ‌ ‌ ‌ بهار از حسرت فرصت بدندان می گزد لبها ص ۶

بی می تکند در کف من خامه روائی ‌ ‌ ‌ سرد است هوا آتش بیدود کجائی ص ۱۶۶

او جز یک دو مورد بهجو نپرداخته و در آن نیز از کلمات رکیک احتراز جسته مثلاً می گوید:

هیچو تو ناقابلی در صلب آدم دیده بود ‌ ‌ ‌ زان سبب ابلیس ملعون سجده بر آدم نکرد

از بحث در بارهٔ انواع مختلف شعری و محاسن و معایب آن و همچنان آثار منثور او بخاطر تنگی مجال چشم پوشیده در اینجا مختصری در بارهٔ پیوندها و علائق غالب با ایران را متذکر می شویم.

غالب اگرچه در هند متولد شد ولی با ایران علاقه ای زیاد داشته و پیوند او با ایران پیوندی فرهنگی و معنوی است. پیوندی که از پیوند های دیرپا و ناگسستنی می باشد این علاقه و شیفتگی او به زبان فارسی و ایران بوده که اغلب

---

[1] تذکر: در برابر تمام ابیاتی که فقط شمارهٔ صفحه قید شده از کلیات غالب مرتبهٔ امیر حسن نورانی چاپ مطبع منشی نول کشور لکهنو، سال ۱۹۶۸ ماخوذ است.

آثار او زبان فارسی می باشد و نه تنها اینکه به نثر و نظم فارسی پرداخته بلکه برای ترویج و پیشرفت این زبان شیرین و شیوا
نیز همت گماشته و قادرنامه و پنج آهنگ را به رشتهٔ تحریر کشیده و یکی از مهم ترین کارهایش که علاقهٔ او بفارسی و ایران را
بمنصهٔ ظهور می رساند کتاب دستنبو است و عجیب اینجا است که این کتاب را بفارسی سره و خالص تحریر نموده و این
کار، همان کاری است که از زمان بازگشت ادبی در ایران به بعد بعضی از ایرانیان کوشش نموده اند که فارسی را از عربی
پاکیزه نمایند- غالب جداً قابل تحسین و صد آفرین است که در دیار هند هم اینچنین کاری را آغاز نماید، مهارت و استادی
خود را در نگارش فارسی بثبوت رساند و همان احساسات را داشته باشد که یک نفر ایرانی دارای غرور ملی و فرهنگی -
اگر این کتاب را مطالعه فرمائید متوجه خواهید شد که غالب جز دو سه مورد که آنرا هم خودش ذکر نموده و معادل فارسی اش را هم
داده، از کلمات عربی اصلاً استفاده نکرده - سرتاسر آثار غالب از نشانهای علائق و پیوندهای او با ایران مملو است تعبیرات
تشبیهات، استعارات، تلمیحات، آداب و سنن ایرانی در جا بجای آثار او بچشم می خورد و در اینجا بعضی از ابیات
او که دال بر این مطلب است نقل می نمائیم:

ولم معبود زردشت است غالب فاش می گویم — بر خس یعنی قلم من داده ام آذرفشانی را ص۳۶

در من هوس باده طبیعی است که غالب — پیمانه به جمشید رساند نسبم را ص۴۴

گاهی خودش را از شهرهای ایران احساس می نماید و می گوید:

غالب ز هند نیست نوائی که می کشیم — گوئی ز اصفهان و هرات و قمیم ما ص۴۴

ناگهان از رنج و مصائب روزگار تنگ آمده و خرابی و ویرانی آن را ذکر نموده لهراسپ و پرویز را صدا می کند:

لهراسپ کجا رفتی و پرویز کجائی — آتش کده ویرانه و میخانه خراب است ص۷۳

غالب می آشام بجام و جمشید علاقه ای فراوان نشان می دهد و بکرّات از آن یاد می کند:

نادان حریف مستی غالب مشو که او — دردی کش پیالهٔ جمشید بوده است ص۷۵

او با آداب و رسوم زردشتیان ایران بخوبی آشنائی دارد و زردشت را خوب می میشناسد

شرار آتش زردشت در نهادم بود — که هم بداغ مغان شیوه دلبرانم سوخت ص۷۷

گاهی دل غالب هوای ایران می کند و دل گرفتگی خود را از هند نشان می دهد!

گرفته خاطر غالب ز هند و اعیانش — بر آن سر است که آوارهٔ عجم گردد ص۱۳۷

غالب که از اهل تشیع بود طبیعی است که بخاک پاک نجف علاقمند باشد و همچنان با ایران که مرکز اهل تشیع و نیازگاه
رندان جهان است چنان چه می گوید:

غالب از هندوستان بگریز فرصت مفت تست — در نجف مردن خوش است و در صفاهان زیستن

غالب مکرّر آرزوی ایران می کند و برایش فرقی نمی کند که در شیراز باشد یا اصفهان یا یزد یا تبریز- او سخت
علاقمند بود که بهر صورت با آن سرزمین ایران که سرزمین آبا و اجداد او است، سفر نماید و در آن جا مسکن گزیند:

غالب از خاک کدورت خیز هندم دل گرفت   اصفهان هی، یزد هی، شیراز هی، تبریز هی ص۳۲۲

دلائل فراوانی برای ایران دوستی و فارسی پرستی غالب وجود دارد که فعلاً از ذکر آن معذوریم۔ اگر خوب دقت نمائیم و آثار غالب را بررسی کنیم باین نکته پی می بریم که غالب از هر لحاظ عاشق و دلدادۀ ایران و زبان ایرانی بود۔ این امر را کردار و گفتار و پندار هر سه بثبوت رسانده است۔ در پایان این مقاله برخی از عبارات و اصطلاحات و ترکیبات را که غالب بکار برده بعنوان نمونه نقل می نمائیم که هم دلیل استادی او در فارسی و هم نشانۀ ذوق سلیم و نیز نمودار علاقه اش بفارسی و ایران می باشد۔

اخترشناسان سپهرپیما = منجمان × پیوستن گاه = محل قران
بهم نمانستن = عدم مشابهت × جامه گذاشتن = مردن
دانندگان فرزبود = دانندگان حکمت الٰهی × فرازمان = فرمان
بازمان = توقف × بزه مند = گناهکار
آویزش = جنگ × زودگرای = عاجل
گیرائی نفس = تاثیر کلام × ناگرفت = ناگاه
چالش = رفتار × کنشهای خردپسند = اخلاق پسندیده
یکتاگزینان = قائلان وحدت الوجود۔

غزل

میرزا اسدالله خان غالب

نفس از بیم خویت رشتۀ پیچیده را ماند   نگاه از تاب رویت موی آتش دیده را ماند
ز جوش دل هنوز خون ریشه در آبست پنداری   بمژگان قطرۀ خون غنچۀ ناچیده را ماند
ز بس کز لاله و گل حسرت نازت همی جوشد   خیابان محشر دلهای خون گردیده را ماند
خوشا دلدادۀ چشم خودش بودن در آئینه   ز سرگرمی نگه صیاد آهو دیده را ماند
غبار از جاده تا اوج سپهر ساده می بالد   ز جوش وحشتم صحرا دل رنجیده را ماند
بهر جا می خرامی جلوه ات در ماست پنداری   دل از آئینه داریهای شوقت دیده را ماند
چه غم ز افتادگیها چون روان پامالست اندوهت   تن از مستی بکویت جان آرامیده را ماند
بهار از رنگ دید در پیشگاه جلوۀ نازش   گدایان نثار از رهگذر برچیده را ماند
رقیبش برده از راه و وفا بنگر که در چشمم   غبار راه او مژگان برگردیده را ماند
جهان وه دلیست از سودا که میگرد اندرش غالب   تو گوئی گنبد گردون سر شوریده را ماند

غالب و ادبیات فارسی

نگارنده: شاهد اقبال

دبیرالملک مرزا اسدالله خان غالب در حدود سال ۱۷۹۶ در آگره بدنیا آمد. پنج ساله بود که پدرش مرزا عبدالله بیگ در نبردی کشته شد. عمویش مرزا نصرالله بیگ که صوبه دار آگره بود سرپرستی او را بعهدهٔ خود گرفت ولی در اندک زمان او هم درگذشت. پس از آن غالب به خویشاوندان مادر خود پیوست و همان جا پرورش یافت. تحصیلات ابتدائی را در حوزهٔ درس شیخ معظم که یکی از معلمین مشهور آگره بود فرا گرفت و مدتی از مردی ایرانی موسوم به عبدالصمد که برای سیاحت به آگره آمده بود زبان فارسی را آموخت و در سیزده سالگی با امراؤ بیگم دختر نواب الهی بخش معروف ازدواج کرده پس از دو سه سال به دهلی منتقل شد و دائماً در آنجا اقامت گزید.

در جوانی غالب مردی خوش اندام و خوش قیافه و خوش خورد و خوش پوش و دوست دار یگانه و بیگانه بود. روزهای شباب را در خوش گذرانی ها بسر برد. به باده نوشی عادت گرفت و تا دم پیری از آن دست نکشید. خویشاوندان مادرش که او را پرورش کردند بسیار متمول و ثروتمند بودند. در آغاز شباب کسی اگر مربی و سرپرستی نداشته باشد، هیچ چیز بیش از آسودگی و تمول نمی تواند برایش مضرت رسان باشد. با شباب مرزا هم تمول وی همان کاری را کرد که آتش با باروت می کند. در عهد شباب آزادی و مطلق العنانی خود را مرزا با این الفاظ ذکر کرده است:

"با فرو فرهنگ بیگانه و با نام و ننگ دشمن، با فرومایگانی هم نشین و با اوباش هم رنگ و پای بی راه پوی و زبان بی هرزه گوی، در شکست خویش گردون را دستیار و در آزار خویش دشمن را آموزگار. تیز رفتاری من از مسجد و بت خانه گرد انگیخته و خانقاه و میکده را به یک دیگر زد."

ولی عواقب این نشاط انگیزی های شباب خوب از آب در نیامد. در روزهای آتیهٔ زندگانی خود مرزا از بابت سیاه روزی و اتلاف عمر عزیز رنج می برد چنانکه می گوید:

با این فروغ گوهر درخشانی نهاد — زین سان سیاه روز کرا کرد روزگار

اصلاً غالب ترک سلجوقی بود و نسبتش به شاه تور بن فریدون می رسد. جدش مرزا قوقان بیگ در دورهٔ محمد شاه پادشاه هند به هندوستان آمد و به ملازمت نواب معین الملک صوبه دار لاهور پیوسته همانجا سکنی گزید. بقول غالب "نیای من که در قلمرو ماوراء النهر سمرقند شهر مسقط الراس وی بود چون سیل که از بالا به پستی آید از سمرقند به هند آمد" در جای دیگر می گوید:

"با لجمله سلجوقیان بعد زوال دولت در هم خوردند. هنگام سلطنت در اقلیم وسیع الفضای ماوراء النهر پراگنده شدند. از آن جمله سلطان تاده ترسم خان که از تخمه او ئیم سمرقند را بهر اقامت گزید تا در عهد سلطنت شاه عالم نیای من از سمرقند به هندوستان آمد"

بایین ترتیب مرزا اصلا تورانی النسل بود. او بر نسب عالی و بر تفوق خانوادهٔ خود افتخار می کرد چنانچه مکرر در ابیات خود اشاراتی باین معنی دارد. مثلاً ؎

غالب از خاک پاک تورانیم   لاجرم در نسب فرهمندیم
ترک زادیم و در نژاد همی   به سترگان قوم پیوندیم
ایبکم از جماعهٔ اتراک   در تمامی ز ماه ده چندیم

غالب در روزهای اخیر زندگانی خود تنگ دست بود و اکثر وام می گرفت. برای افزایش عایدات خود رنج سفر کلکته را بر خود هموار کرد ولی موفق نشد. فقط ماهی پنجاه روپیه اندر بار بهادر شاه برای وی مقرر بود. او هفت فرزند داشت ولی همه در کودکی مردند. خواهر زادهٔ زن خود مرزا عارف را متبنی ساخت ولی او هم در جوانی فوت شد. برادرش مرزا یوسف در جوانی از سودای دماغ مرد. او در روزهای شورش هند صعوبت های بسیار کشید. در ایام پیری باتهام قماربازی محکوم به حبس شد و سه ماه در زندان گذرانید. اواخر عمر او با علالت و اندوه گذشت. در سال ۱۸۶۹ میلادی در دهلی بدرود حیات گفت. آثار فارسی او بقرار زیر است:

نثر: (۱) پنج آهنگ (۱۸۷۰ میلادی). مجموعهٔ مقاله ها است بتفصیل ذیل.

آهنگ اول مقاله ایست در نامه نویسی. آهنگ دوم راجع بر مصطلحات و مصادر فارسی می باشد. آهنگ سوم دارای منتخبات اشعار خود شعر و محل استعمال آنها در نامه ها است. آهنگ چهارم مشتمل بر تقاریظ و مضامین متفرق است. آهنگ پنجم مشتمل بر مکتوبات فارسی است.

(۲) مهر نیمروز. تاریخ شاهان تیموری است که بحکم ابو الظفر بهادر شاه در ۱۸۵۲ تالیف شد.

(۳) دستنبو. مشتمل بر احوال و واقعات شورش هند در نثر فارسی خالص (در سال ۱۸۵۷ میلادی تالیف گردید)

(۴) قاطع برهان یا درفش کاویانی. مشتمل بر اعتراضات و تنقیدات بر فرهنگ معروف فارسی بنام برهان قاطع میباشد در سال ۱۸۵۹ برشتهٔ تحریر در آمد.

شعر: (۱) کلیات. مشتمل بر قصیده و غزل و مثنوی و رباعی است و دارای ده هزار و چهار صد و بیست و چهار بیت می باشد.

(۲) مثنوی ابر گهربار بسبک شاهنامهٔ فردوسی دربارهٔ جنگ های اسلام نوشته شده که متاسفانه ناتمام ماند.

(۳) سبد چین. مجموعهٔ دیگر نظم فارسی مطبوعه ۱۸۶۷-۲. مشتمل بر قصاید و قطعات و مثنوی و ترکیب بند وغیره می باشد.

راجع به پیوند غالب با ایران و مردم آن کشور، آنچه از قرائن تاریخ و از بیان مرزا استنباط می گردد این است که او تورانی نژاد بود و غیر از عبد الصمد ایرانی که از او مبانیان فارسی را آموخت با هیچ ایرانی دیگر تماس نداشت. ولی در هیچ

تماس یافته یک مرد خوش قریحهٔ ایرانی بود که میرزا نوشته مجمع زبان و ادب فارسی را دریافت و پس از آن در این زبان استعداد کامل حاصل کرد که در سایهٔ آن با اهل زبان لاف همسری می زد و حتی فارسی را وسیلهٔ اظهار افکار ادبی خود قرار داد و تا مدتی مدید تخلیقات ادبی منثور و منظوم فارسی از قلم او تراوش میکرد. چنانچه در بعض جاها نسبت به فارسی دانی خود اظهار فخر کرده است.

دامنهٔ آثار منثور غالب از دامنهٔ آثار منظوم وی وسیع تر می باشد ولی نکته جالب اینست که نثر وی را تنها از این لحاظ می توانیم اسم نثر بدهیم که فاقد اوزان شعری است والا صرف نظر از بحر و وزن وغیره عنصر شعریت در نثر وی بعض جاها بیشتر از خود نظم دیده می شود و مجموعهٔ بزرگ نثر غالب که نامه ها نیز شامل آنست دارای نمونه های اینگونه نثر منظوم می باشد. میرزا اگرچه در نثر خویش از نثر نگاران نامور مثل ابوالفضل و ظهوری پیروی کرده و از طرز نگارش ایشان استفاده نموده است ولی در نثر وی ظرافت و لذت عجیبی دیده می شود که در نثر دیگران اصلاً وجود ندارد. بطور نمونه در اینجا قطعه ای از نثر غالب را نقل می کنیم۔

"روی آوردن من از عدم بوجود به سودای گوهری و گوهر فروشی بود۔ کالای بیش بهای من درین چار سوی روای ندید و متاع گرانمایه مرا درین بازار از رمش ارزانی نشد۔ ناچار هرچه با خویش آورده ام و چون گویم که با خویش می برم۔ لختی در سفینه ها و پارهٔ در سینه ها می گذارم و می گذرم۔ پس از من آن گنج شایگان را اگر همه باد ببرد گو ببر و اگر همه خاک بخورد گو بخور۔ سینه آرزوهای جوان مرگ مرا مدفن است و لمعهٔ نگاه گرم چراغ گور غریبان بادا"

حالا می پردازیم به ذکر شعر غالب۔

در بزم غالب آ و به شعر و سخن گرای　　　خواهی که بشنوی سخن ناشنوده ئی

غالب در هند برای اشعار زبان اردو خود معروف است ولی او خود اشعار فارسی خود را مایهٔ افتخار می دانست چنانکه می گوید ؎

فارسی بین تا ببینی نقش های رنگ رنگ　　　بگذر از مجموعهٔ اردو که بی رنگ من است

میرزا اندکی پیش از مسافرت کلکته بفارسی شعر گفتن آغاز کرد و در دوران این مسافرت چند غزل، یک مثنوی و بعضی قصیده های نغز فارسی ساخت۔ از زمان ۱۸۲۷ تا ۱۸۴۷ میلادی زبان ادبی غالب اغلب فارسی بود۔ پس از آن جهت او بنابر تعلق با دربار و اوضاع زمان توجه خود را بیشتر به اردو معطوف داشت معهذا شعرگوئی فارسی را کاملاً ترک نکرد و این حقیقت از آثار وی بخوبی آشکار می گردد۔ شعر وی مشتمل بر قصیده، غزل، رباعی و مثنوی می باشد ولی قسمت عمده آثار او را قصیده و غزل تشکیل می دهد۔

قصاید غالب که قطعه، لوحه، ترکیب بند و مخمس هم شامل آن می باشد، از لحاظ کمیت و کیفیت از صنفهای دیگر سخن ممتاز تر است۔ اگرچه ابیات غزل غالب بعضی جاها نسبت به شعرا استادان فحل بی مزه می نماید و با صطلاح چنگ به دل نمی زند ولی قصیده وی از ابتدا تا انتها همان قدرت و بلندی را دارد۔ وی در قصیده خود از قصیده نگاران نامور مثل

خاقانی و عرفی پیروی نموده و در تتبع ایشان بکلی موفق شده است۔ غالب قصیده های بتقلید شاعران مذکور، در ردیف و قافیه قصیده های ایشان ساخته است۔ مثلاً قصیده اول در کلیات میرزا که مطلعش:۔

ای زوہم غیر غوغا در جہان انداختہ گفته خود حرفی و خود را در گمان انداختہ

است در جواب قصیده مشہور عرفی می باشد که بیت اولش این است ؎

ای متاع درد در بازار جان انداختہ گوہر ہر سود در جیب زیان انداختہ

ہمین طور این قصیده غالب ؎

خواہم که ہمچو نالہ ز دل سر بر آورم دود از خود و شرارہ ز آذر بر آورم

بتقلید قصیده خاقانی نوشته شده که مطلعش این است ؎

ہر صبح پای صبر بدامن در آورم پرکار عجز گرد دل و تن در آورم

و این قصیده: داور سلطان نشان آید ہمی سرور گیتی ستان آید ہمی

که او در مدح ولیعہد شہزادہ فتح الملک نوشته بود بتقلید قصیدہ مشہور رودکی می باشد که مطلعش چنین است:

بوی جوی مولیان آید ہمی یاد یار مہربان آید ہمی

وقتی که میرزا بفارسی سخن گوئی آغاز کرد در ہند دو طرز مروج بود یکی طرز نظیری و عرفی و دیگر طرز بیدل۔ کسانی که می خواستند بفارسی شعر گویند یکی از این شیوہ ہا را اختیار می کردند۔ غالب اول در شعر خود بیدل را سرمشق خود قرار داد و در ہمین طرز غزلہا گفت۔ بعضی از این قبیل غزلہا در کلیات وی دیدہ می شود که در آنہا تشبیہات غریب و استعارات دور از فہم و لغات مشکل و معانی دقیق را زیاد بکار بردہ است۔ ولی چون این شیوہ را قبول عام حاصل نبود و نیز با روش اہل زبان مغایرت داشت او طرز بیدل را ترک کردہ شیوہ عرفی و نظیری را اختیار کرد که از آن در شعر وی سلاست و روانی بوجود آمد۔ غالب این تغییر روش خود را با این الفاظ ذکر کردہ است:۔

"ہر چند منش که بیزدانی نمودش است در سرآغاز بتر پسندیدہ گوی و گزیدہ جوی بود اما پیشتر از فراخ روی پی جادۂ ناشناسان برداشتی و کژی رفتار آنان را لغزش مستانہ انگاشتی تا ہمدردان تکاپو پیش خرامان را به خجستگی ارزش ہم قدمی که در من یافتند مہر جنبید و دل از آزرم بدرد آمد۔ اندوہ آوارگیہای من خوردند و آموزگارانہ در من نگریستند۔ شیخ علی حزین بخندۂ زیر لبی بی راہ رویہای مرا در نظرم جلوہ گر ساخت و زہر نگاہ طالب آملی و برق چشم عرفی شیرازی مادۂ آن ہرزہ جنبش ہای ناروا در پای رہ پیمای من بسوخت۔ ظہوری بہ سرگرمی گیرائی نفس حرزی بہ بازوی و توشہ بر کمرم بست و نظیری لاابالی خرام بہنجار خاص خودم بجالش آورد۔ اکنون بیمن فرۂ پرورش آموزگاری این گروہ فرخندہ گروہ کلک رقاص من بخرامش تدرو است و برامش موسیقار و بجلوہ طاؤس است و بہ پرواز عنقا۔"

ولی ترک روش بیدل فقط بہ زبان و طرز بیان محدود بود و در فکر وی حتیٰ خیلی بعد از آن طرز بیدل آشکار است در غزلہائی که

پس از آن نوشته شد رنگ ظهوری مطالب نمایان است ولی از تنزاع عرفان و تصوف تغزل وی به غزل نظیری نزدیکتر است۔ در غزل فارسی هیچ شاعری بزرگتر از حافظ ظهور نکرده ولی تعجب اینجا است که غالب بجای بزرگترین غزل گوی فارسی، نظیری را برای خود نمونه و سرمشق قرار داد۔ نسبت به پیروی نظیری غالب با افتخار گفته است ؎

جواب خواجہ نظیری نوشته ام غالب　　خطا نموده ام و چشم آفرین دارم

ولی از حافظ نحوی ذکر کرده که گویا اهمیت خاصی برای او قایل نیست۔ یکی از غزلهای او نیست ؎

غالبم تشنه تلخاب نه بحر حافظ　　مائل شاخ نباتم تنه تا هایا هو

در جای دیگری گوید ؎ آنکه پندارم حافظ بوده است　　غالب آشفته بود آن نیز هم

شعر مرزا بیان احساسات و تجربات ذاتیست۔ قسمت بیشتر زندگانیش مجموعه تلخ کامیها و نامرادی ها بود از ین رو تاثیر عمیقی در کلامش پیدا شده و ابیاتش دارای سوز و گداز زیاد است۔ وی هیچگاه در برابر مصائب و شدائد دنیا سپر نمی انداخت بلکه پیوسته بر خلاف روزگار ناموافق جد و جهد می کرد۔ خودش گفته است ؎

بوادیی که در آن خضر را عصا خفت است　　بسینه می سپرم راه گرچه پا خفت است

ولی از عجز خود در برابر احکام قضا و قدر آگاه بود بدین سبب باری چون او را باتهام قماربازی محکوم به حبس کردند در زندان ترکیب بندی نوشت که در آن بے چارگی خود را باین الفاظ بیان کرده است ؎

من نه آنم که ازین سلسله ننگم نبود　　چه کنم چون بقضا زهره جنگم نبود

میرزا سرد و گرم زمانه را چشیده بود و می دانست که اگر در دنیا عیش و نشاط را ثباتی نیست رنج و ملال را نیز دوام نیست بقول معروف ع هم خزان و هم بهار در گذر است پیش چشمهایش چراغ سلطنت مغولها خاموش شد و بازار قتل و خونریزی در دهلی گرم شد۔ وی نیرنگی های روزگار را تماشا کرد و تلخیهای زمانه را چشید و این مجموعه درد دنیا و درد دل را در پرده شعر پیش مردم عرضه نمود۔ اگرچه عنصر غم در اشعارش غالب است ولی غم او غمی نیست که طبع را مریض و دل را پژمرده کند بلکه غم او غم مردی سالم و تن درست است که بعد از کوشش های پیاپی و عدم موفقیت بوجود می آید۔ این غم مردم را درس سیری و ترک دنیا نمی دهد بلکه خوش طبعی و زنده دلی را بر اندوه و ملال غالب می سازد چنانکه گوید :

پیرم ولی به طبع جوانان گران نیم　　خون خوردنم نهفته و می خوردن آشکار

وی مانند اقبال لاهوری در اشعار خود مردم را هیچ فلسفه معین زندگی و یا پیغام واقعی نداده است ولی دارای احساسات عمیق و نگاه های ژرف و تیز است۔ او زندگانی و حقایق عشق را با ژرف بینی مطالعه نموده و از قلب انسانی و کیفیات آن آگاهی تمامی حاصل کرده و طوری آنها را در شعر خود گنجانده که برای یک عالم روان شناسی هم بمشکل میسر است۔ مثلاً این ابیات ؎

از ناله ام مرنج که آخر شد است کار　　شمع خموشم و ز سرم دود می رود
مدعی خواست رود بر اثر من غالب　　آنچه خود داشت به سودای جنون برد نرفت

در شعر غالب نظریهٔ بلند و برتر عشق را که دو قالب را یک جان میکند و عاشق از آن قرار و سکون یافته و در دنیا لذایذ
جنّت حاصل می کند و محبّت را دوای همهٔ دردهای خود می داند نمی بینیم. عشق غالب عشق یک عاشق بوالهوس است
که فقط در تصور محبوب لذت نمی یابد بلکه می خواهد که از قرب جسمانی او تمتع اندوزد و خوب درک می کند که این چنین محبّت عقلی بجز
کشمکش روحانی و حرمان و نا امیدی چیزی بار نمی آورد. غالب در اکثر اشعار خود مضامین محبّت رسمی را با چاشنی خیال
آسانی خود بیان می کند ولی در بعض جاها احساسات حقیقی و عواطف قلبی او در قالب شعر ظاهر می شود مثلاً:

همواره ذوق مستی و لهو و سرود و شور   پیوسته شور شاهد و شمع و می و قمار

نظر غالب وسیع، و بر جنبه های گوناگون محبّت محیط بود و به همین سبب او گفت که:

او جسته جسته غالب دامن دسته دسته ام   حرفی کسی است لیک تو چون من دریغ چه بحث

یا مثلاً در کلام شاعران پیشین فقط عاشق نامراد و مایوس بنظر می آید و دیگران همه کامیاب، ولی غالب با وجود گرمی احساسات
تصویر حقیقی زندگانی را می بیند و در کلامش بیت هائی می بینیم که از شیوهٔ رسمی عشق مشرقی مختلف می باشد مثلاً ؎

ما هم به داغ دلا به تسلی شویم کاشش   ناکامان ز بزم دوست چه خوشنود می رود

گذشته از سلاست، روانی و بلندی خیال امتیازهای دیگر او شوخی و ظرافت گفتار است که جزء کلام او است و بنیاش
بر جدت طرازی وی استوار شده است. ابتدا کلامش دقیق و از لطافت و ظرافت خالی بود ولی چون عقل سلیمش بر کشمکش
داخلی وی چیره شد دلش شگفته شد. فهم و دانش وی را بجای سپر انداختن پیش احساسات، دست و پنجه نرم کردن با
آنها یاد داد و بنا بر آن از تجربه های گوناگون زندگانی بهره ور شده و از نشیب و فراز زمانه آگاهی یافته تبسم کردن بر اوضاع
ناسازگار را بجای اشک ریختن شعار خود ساخت ؎

راندان خری دهر کرده اند   خنده بر دانا و نادان می زنم

غالب در حال غم و اندوه شگفتگی طبع را بطور شگفت آوری نگاه می داشت. وی میگوید ؎

ازان بگلشن گیتی نشاط می ورزی   که بوی زهر همی نشنوی ز ریحانش

او در زندگانی با سختیها و رنجها دچار شد و از تفکر دربارهٔ فلسفهٔ غم و اندوه او را بصیرت عارفانه ای حاصل شد چنانکه گوید:

ز رنجوری من مخور غم که من   ندارم غم هستی خویشتن

نه جان از من است و نه جسم آن من   خود از مردن من چه نقصان من

گر چه او برای پنهان کردن غم خود دست به شوخی و بذله سنجی میزد ولی بذله سنجی وی معمولی و سطحی نیست بلکه بسیار موقر است و بیگاه
از خنده زیر لبی تجاوز نمی کند. مثلاً:

در قالب ملا الرحمٰن پرده کشا شد   خاکی که قضا در تن گوساله فرو ریخت

پاکست خور امروز نهاراز پی فردا منه   در شریعت بادهٔ امروز تا به فردا آتش است

وی با همه نوع بشر محبت می کرد و شادمانی و افسردگی دیگران را شادمانی و افسردگی خود می شمرد. این حساسیت

طبع دردمندش سوز و گداز و در شعرش حسن تأثیر پیدا کرده شمع سخنش را فروغ خاصی بخشید. ابیات ذیل را ملاحظه فرمایید:

نال قلم از جوشش گداز دل خویشم — سیراب بود همچو رگ ابر ز دریا
رخشانی معنی دمد از پردهٔ لفظم — چون شمع ز فانوس و چو لعل ز مینا
میراث رسیده است ز خونین نفسانم — داغی شرربالد و بیانی جگر آلا

ابیات غالب گاهی خیلی ژولیده و پیچیده است و خیال ساده ای را بطوری ادا می کند و در معانی چنان عمق پیدا می کند که بعد از اندیشه و فکر فراوان مفهوم آن بدست می آید. حتی گاهی افراط در دوربینی و ابهام بعضی از ابیات او را بصورت لغزها در آورده است. گاهی از یک خیال به خیال های دیگر پردازی می کند و نیمهٔ خیال را در یک مصرع اظهار می کند و چیزی از آن حذف نموده در مصرع دوم نیمهٔ دیگر را اظهار می کند و شنونده بعد از تفکر و تامل بسیار آن خلاءها را پر کرده به معنی پوشیده می رسد. مثلاً این بیت:

گفتم ز کرم پرسم غم عمر گذشته — ساقی بقدح بادهٔ ده ساله فرو ریخت

غالب بیشتر زندگانی خود را با تنگ دستی و عسرت گذراند ولی مردی زیرک و باهوش بود و میخواست که بوسیلهٔ مدیحه سرائی و لابه گری از نعمت های دنیا بهره مند گردد و به وقار و احترام خود بیافزاید. قصیده های وی بلند پایه است و میتوان بعضی از آنها را در برابر قصاید شعرای نامدار فارسی قرار داد. وی در بارهٔ خود می گوید:

امروز من نظامی و خاقانیم بدهر — دهلی ز من به گنجه و شروان برابر است

مقام تاسف است که غالب برای زحمتهای خود صلهٔ شایانی نیافت زیرا که ممدوحین وی یا پادشاهان و امیرانی بودند که برای قدرشناسی نه وقت داشتند و نه زر، و یا منصب داران فرنگی دولت بریتانیا که از زبان و ادب فارسی بکلی بیگانه بودند. ولی چون غالب استعداد طبیعی داشت و در زمان وی یک گروه مردم سخن شناس همچو مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدر الدین آزرده، حکیم مومن خان مومن وغیره که چندتن از آنان خودهم شاعر بودند گرد وی جمع شده بودند و تحسین و انتقاد آنها قریحهٔ نظرش را جلا می داد و او شعر می سرود غافل از آن که این کار سبب شهرت او برای آن صلهٔ مناسب نخواهد یافت.

شعر فارسی غالب فقط بدین سبب اهمیت ندارد که گفتهٔ معروف ترین شاعر زبان اردو می باشد بلکه اهمیت آن از این لحاظ است که دارای ارزش و مزایای خاصی، و سزاوار تحسین و تمجید است. اصلاً غالب یکی از درر آبدار رشتهٔ شعرای فارسی سرایان هندی باشد که از مسعود سعد سلمان شروع شده به اقبال لاهوری پایان می یابد. بعضی از ناقدان ادب ایرانی و مستشرقین همنوای آنها بعلت عصبیت ملی و یا در اثر اصول تحقیق اروپائی شاعران فارسی گوی هند را در خور اعتنا نمی شمارند و بعضی هندیها هم شعر فارسی هند را جزو ادبیات این کشور نمی شمارند. اما کسانیکه دارای قریحهٔ ادبی و فهم و بصیرت می باشند و در شعر و ادب اختلاف کشور و مذهب را در میان نمی آورند ارزش این اشعار را می شناسند. اشخاصی که کلام فارسی غالب را مطالعه می کنند میدانند که شاعران فارسی گوی هندی هم دارای چیزهائی هستند که از لحاظ قدرت زبان و بیان و بلندی خیال اقلاً بهتر و بلندتر از شیوهٔ کلاسیکی ایران در دورهٔ بازگشت ادبی می باشد.

تو ای که محو سخن گستران پیشینی — مباش منکر غالب که در زمانهٔ تست

میرزا غالب

نگارنده: نعیم الدین

میرزا اسدالله خان متخلص به غالب معروف به میرزا نوشه، وملقب به نجم الدوله دبیر الملک نظام جنگ در شب هشتم ماه رجب سنه ۱۲۱۲ه در شهر آگره بدنیا آمد. نیاکانش از دودمان ترکان ایبک بوده اند و نسب او، به تور فریدون می رسید. چون سلطنت سلجوقیان انقراض یافت چندتن از بزرگانش باطراف مختلف پراگنده شدند از آنها یکی بنام ترسم خان بود که در سمرقند طرح اقامت افگند. جد اسدالله خان که در زمان شاه عالم از سمرقند به هندوستان آمد از احفاد همین ترسم خان بود.

صرف نظر از ذوق شعری و ادبی که از آن طبعش سرشار بود به زبان فارسی قدرت کامل داشت و نکاتی جالب در نگارش خود بوجود می آورد. میرزا در ایراد معانی ظریف و لطیف از شعرای ایران کمتر نبود. مسائل تصوف، شوخی، رندی، بیباکی، بیان غم واندوه، شکایت زمانه، اظهار محبت و همدردی، حسن طلب وغیره مطالبی بود که غالب به چیره دستی تمام آنها را در کلام خود جلوه گر نموده است. وی در شعر و نثر فارسی بطور مساوی ورزیده بود. در برابر نثر او نوشته های ابوالفضل و ظهوری بی مزه بنظر می رسد. قصاید او هم پایۀ گفته های انوری و خاقانی است و غزلهای او بطور کلی از غزلیات عرفی و طالب بهتر بود و در رباعی همسر خیام می باشد.

اوّل میرزا غزلهای فارسی را باستقبال از سبک بیدل می سرود ولی کم کم آن سبک تغییر یافت و بالاخره رنگ غزلهای عرفی، ظهوری، نظیری وطالب آملی در غزلهای او غلبه یافت. غزلهای فارسی او دارای شیرینی و لطافت می باشد و نیز ابیات او دارای اشاراتی هست که محتوی به صفات الهی و توحید باری میباشد

شاهد حسن ترا در روش دلبری — طرۀ پرخم صفات موی میان ماسوا
آب نه بخشی بزر چون سکندر بدر — جان نه پذیری به هیچ نقد خضر ناروا
بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب — ساز ترا زیر و بم، واقعۀ کربلا
ساده ز علم و عمل مهر تو ورزیده ام — مستی ما پایدار باده ما ناآشنا

در مدح پیغمبر صلی الله علیه وسلم می گوید ؎

ای خاک درت قبلۀ جان و دل غالب — کز فیض تو پیرایۀ هستی است جهان را
تا نام تو شیرینی جان داده به گفتن — در خویش فرو برده دل از مهر زبان را

و در این ابیات شوخی و مطایبه را خیلی خوب بیان نموده است:

حال ما از غیر می پرسی و منت می بریم — آگهی بارے کہ آگہ نیستی از حال ما

ز ما گسستی و با دگیان گرو بستی — بیا کہ عهد وفا نیست استوار بیا

گر پس از جور بہ انصاف گرآید چہ عجب — از حیا روی بما گر ننماید چہ عجب

بودش از شکوہ خطر ورنہ سری داشت بمن — بہ آزارم اگر از مهر بیاید چہ عجب

غالب بہ مسائل تصوف ہم علاقہ داشت و بعضی از غزلیات بہ سبک شعرای عرفانی سرودہ مثلاً این ابیات:

خطے بہ ہستی عالم کشیدیم از مژہ بستن — ز خود رفتیم و ما ہم با خویشتن بردیم دنیا را

عالم آیینہ راز است چہ پیدا و چہ پنہان — تاب اندیشہ نداری بہ نگاہی دریاب

بحث و جدل بجای مان می کدہ جوی کاندر آن — کس نفس از جمل نبرد کس سخن از فدک نخواست

فرصت از کف مدہ و وقت غنیمت پندار — نیست گر صبح بہاری شب ماہی دریاب

قسمت بزرگی از شعر غالب را مضامین و کلام رندانہ او تشکیل می دہد

سخن کوتاہ، مرا ہم دل بتقوی مائل است اما — ز ننگ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا

می باندازہ جام آمدہ ساقی برخیز — شیشہ خود بشکن، بر سر پیمانہ ما

دل خستہ غمیم و بود می دوای ما — با خستگان حدیث حلال و حرام چیست

مفتیان بادہ عزیز است مریزید بخاک — جوشد از پردہ دیگر خون سیاوش مباد

تعداد ابیات غالب تقریباً بچہار ہزار می رسد کہ برای ادبیات فارسی سرمایہ پر ارزش بشمار می رود. وی در اشعار خود تمام مسائل حیات و ممات را ذکر نمودہ و اظہار عقاید خود در میان گذاشتہ. تعداد رباعیات غالب بہ یکصد و بیست و پنج می رسد کہ بیشتر آن دارای مطالب رندی و بادہ خواری و خوش گذرانی و شکایت از روزگار می باشد. برخی از آنان برنگ متصوفانہ ہست و بارہ ای از این دوبیتی ہا راجع بہ مطالب گوناگون و متفرقہ ہست. بطور کلی میرزا در خمریات خود از عمر خیام پیروی کرد.

قصاید غالب کہ در آن قطعہ و مرثیہ و ترکیب بند و ترجیع بند و مخمس ہم شامل است چہ از نظر تعداد و چہ از نظر ارزش ادبی ممتاز ترین صنف شعری محسوب می شود ولی با اینہمہ غزلہای او از سرودہ ہیچ گویندہ کم تر نیست بلکہ از ہر حیث بر آنہا فوقیت دارد. قسمتی از غزلیات او ہم می باشد کہ در آن شکوہ و جلال تغزل باوج کمال رسیدہ ولی این سبک وی خالی از صنایع لفظی و معنوی نیست.

غالب در قصائد گاہی از قاآنی تتبع کردہ است و گاہی از سلمان ساوجی، عرفی و نظیری و در این مسابقہ پیروز و موفق بودہ. تشبیب قصیدہ ہای غالب نسبت بہ مدیحہ او قشنگتر و زیباتر جلوہ می نماید. در این مورد برخی تشبیبات قصائد غالب از تشبیبات قصائد عرفی ہم زیباتر است چنانکہ در این قصیدہ:

ای ز وہم غیر غوغا در جہان انداختہ — گفتہ خود حرفی و خود را در گمان انداختہ

دیده بیرون و درون از خویشتن گرد آگهی | پرده رسم پرستش در میان انداخته
نقش بر عالم ز حرف بی صدا انگیخته | شور در عالم ز حسن بی نشان انداخته
چرخ را در قالب ابداع در وا ریخته | خاک را بر نطع پیدائی ستان انداخته

در این قصیده:

بیا در کربلا تا آن کشاکش کاروان بینی | که در روی آدم آل عبا را ساربان بینی
نه بینی هیچ بر سر خازنان گنج عصمت را | مگر در خار بن ها تار و پود طیلسان بینی
همانا سیل آتش پرده بنگاه غریبان را | که هر جا پارهٔ از رخت دود آندخان بینی
بیینی چشمهٔ از آب چون جوئی کنارش را | ز خون تشنه کامان چشمهٔ دیگر روان بینی

در وصف موسم بهار می گوید:

شکر که آشوب برف و باد سر آمد | خامه از بند زمهریر بر آمد
کسب هوا نفع آب خضر رساند | سبزه جهان را به بشر راهبر آمد
در چمنستان گشوده بار نوادر | باد که بازارگان بحر و بر آمد
اشتلم انتظار گل بود ار ست | دیده نرگس ز حدقه چون بدر آمد
تا ز چه دانسته قرب مقدم گل را | سبزه به باغ از شگوفه پیشتر آمد

نثر

نثر فارسی غالب نسبت به شعرش بیشتر است و غالب در آثار نثری خویش از سجع استفاده کرده و عبارات مقفع و مسجع آورده است. گویا وی علاقه ای فراوان به نثر مصنوع و سبک هندی داشته و بهمین جهت نکات و مختصات این سبک را در نثر خود حفظ نموده است. بهترین نمونهٔ این نثر را در دیباچه مهر نیمروز توان دید. در دیباچه مهر نیم روز پس از حمد و نعت و مدح پادشاه خطاب به ابوظفر سراج الدین بهادر شاه می نماید و می گوید:

"تا آن شیوهٔ خاقانه و خواقین خدا آگاهانه! روی آوردن من از عدم به وجود بسودای گوهر سنجی و گهر فروشی بود، کالای بیش بهای من در این چارسو روی روائی ندید، و متاع گرانمایهٔ مرا در این بازار اندیشی ارزانی نه شد، ناچار هر چه با خویشتن آورده ام چون گویم که با خویشتن می برم. لختی در سفینه ها و پارهٔ در سینه های گذارم. پس از من آن گنج شایگان را گر همه باد برد گو ببر و اگر همه خاک بخورد گو بخور. سینه آرزوهای جان سیر را مدفن است لمعهٔ نگاه گرم چراغ گور غریبان باد.... الا"

پاره ای از حادثی که در مهر نیمروز درج شده، بعنوان نمونه ای از نثر غالب در ذیل نقل می شود.

از رویداد قبل خان که از نیاکان امیر تیمور بود "خان خطا با خویشتن سنجید که با قهرمان قوم مغل مهر ورزد مهرانگیز نامه‌ای داشت، و گزیده روشی را به نامه بری

و میانجی گری گماشت، فرستاده آمد، و جهان پهلوان قبل خان را زمین بوسید، و نامه سپرد و پیام گزارد. حرفه در آشتی ۹
بودن در فرو گذاشت. قاجولی بهادر رسم بجای، خرد نشاند، و بهم عثانی نامه آورد ترسن تیزگام سوی خطا را مدد فرمانده
آن کشور سران لشکر را پذیره فرستاد. مهمان را بخوشترین نشیمن فرود آورد. و پادشاه بهر بارگاه بر یک خوان نشستند
و نان خوردند، در افق آشامیدند. مگر خردپیشه قبل خان را در اندیشه گذشته باشد که مبادا خطائیان زهر بر باده آمیزند،
و بدین رنگ خون میهمان ریزند، در هر بزم پس از اندکی مایه درنگ به بهانه آب تاختن برون آمدی و به ستم شگوفه
کردی و خورده آشامیده از دهن فرو ریختی. چون به بزم اندر آمدی دیگر باره ساغر گرفتی و خوردنی از سر گرفتی.
خطائیان به شگفت فرو مانده که یارب این چه نیرومند و زور آور کسی ست که از ما بیشتر می خورد و خورش را برومی
گرانی نیست، وی از ما فزون تر میگسار و هشیار تر از ماست۔۔۔۔!"

در ترجمه احوال امیر تیمور اینطور نوشته است:

"روزی، میانه امیر قزغن را امیر طراغای در باره او لوس و قشون سخن می رفت و فرزانه فیروزی فر امیر تیمور
دلاور با پدر هم زبان بود۔ پدر را از گفتار باز داشته خود بشگرفی سخن سرای شد، و بدان هنجار زمزمه چند بر تار گفتار زد که
امیر قزغن در آن ستوا بیانی و گهر افشانی بمهر دل بست و با آفرین زبان بر کشاد۔ سخن گوی، فرو هیده امیر را پسر خواند،
و بهاران بزم او لجای تو ترکان خواهر امیر حسین نبیره خویشتن را با آئین دین و قانون شرع بوی سپرد تا خویشی بر
خویشاوندی افزاید، را آمیزش، چون شیر و شکر در میان آید۔ امیر جهان جوی پس از آن پیوسته با امیر قزغن در بزم همنشین
و همدم و در رزم پیشتاز و پیش آهنگ بودی۔ از نبرد آزمایان برلاس و دلاوران جغتا هر کدام دست بر دگر رستی شگفتی
فرو ماندی "دو دست مریزاد"، گویا بسان دست و بازو آفرین خواندی۔ پس از امیر قزغن که در ماکرشتی تغلق تیمور
ناگاه در شکارگاه کشته گشت۔ جهان پهلوان تهمتن توان نه تنها دامن همت والا گرفت، و در تیغ زنی و خصم افگنی کارش
بالا گرفت"۔

اگرچه غالب بطور کلی الفاظ عربی را خیلی کم بکار برده ولی در کتاب دستنبو که در دوران حوادث اولین جنگ
آزادی در سال ۱۸۵۷م در لاور آن گرد آورده مخصوصا سعی نموده است که مداخل کلمات و اصطلاحات عربی را بکار
بردولی با این همه او در این اثر سبک خاص خود را که فقط و فقط مخصوص اوست از دست نداده است۔ اقتباسی از همین
اثر را در ذیل ملاحظه میفرمائید:

"چاشت گاه دوشنبه شانزدهم ماه رمضان یازدهم می سال یک هزار و هشتصد و پنجاه و هفت تا گرفت
در و دیوار باره را روی، دهلی بجنبید و آن جنبش زمین را فرا گرفت۔ سخن در زمین لرزه نمی رود، در آن روز جهان سوز
بخت برگشته و سرگشته چندی از سپاه کینه خواه میرٹھ بشهر در آمدند همه بی آزرم و شوری انگیز و بخدا و ند کشی تشنه خون انگیز۔
دیدبان دروازه های شهر که بردن از نگهبانی دهم بیشی شگفت که هم از پیش هم سوگند بودند، هم پاس نمک، وهم پاس شهر
گذاشتند و مهمانان ناخوانده را خوانده را گرامی داشتند۔ آن سواران سرگران سبک جلو و پیادگان تند خوی تیز دو

چون درها باز و دربانان را مهمان نواز یافتند دیوانه وار به هر سو شتافتند، و هر کرا از فرومانده‌هان، و هر کجا آرامشگاه آن مهمان یافتند تا زار نگشتند جایی که نه سوختند بلکه از آن سوی برتافتند...!!

در آغاز دیباچهٔ دیوان خود ضعف و انحطاط قوای جسمانی و از دست رفتن نیروی بدن خود را این طور بیان می کند:

«هان ای غالب تیره روز دژم اختر! که بدین هستی و کسانی که تراست بدان مانی که دانی در عالم فرض محال سپندی دیده ایم بر آتش آرمیده. الله الله چه مایه جوش سوداست که به تفسیکی می کشی. چون خطی که از نقطه برآورند هر رنگ سویدا است. آن قلمرو اندیشه که از روانی خامه و رواج گفتار آب و هوا داشت، دی بهش را فرودین پرستار بود، چه آشفتگیش را نسیم سحری پیشکار. بدین ناخوشی و نژندی ویران چرا است. سبزه را چه افتاد که برچیدن دل از دست تماشاییان برد، و غنچه را چه روی داد که بر دمیدن پردهٔ شکیب نظارگیان نه درد...!»

قسمت بزرگ نثر فارسی غالب را نامه های او تشکیل می دهد که بیشتر از آنها ساده و روان می باشد. نامه ای که بعد از مرگ نواب احمد بخش خان به جانشینش شمس الدین احمد خان نوشته نمونه ای از سبک وی می باشد.

«میر فضل مولی خان نام یاری داشتم. او را ناگرفت در عرض راه به هر خدا آباد یافتم در مورد گفتگوهای و بهائی که رفت. از جامه گداشتن فخر الدوله بهادر یمن خبر داد و باز کلکته مرزا افضل بیگ و دیگران برگفتند، آوخ که چراغ روشن این دودمان مرد، و شبستان آرزوها تیره و تار شد. از جانب شما اندیشناکم و دانم که آنچه شما را پیش آمد دل خواه نباشد. ناکسان را روز بازار خواهد بود، و فرومایگان را گرمی هنگامه، زود اکه انجمن از هم پاشد، پراکندهٔ چند گرد آیند. دولت روی گرداند و آسودگی برخیزد. زنهار هوشمندی را کار باید بست و همواره بخود نگران باید بود....»

اگرچه در سروده های غالب تعداد قصاید مدحیه بر همه اصناف سخن می چربد ولی خود او در جاهای مختلف اظهار تأسف نموده است که قسمت بزرگ عمر او در هرزه گویی صرف شده است ولی پس از تلاش گاهی پی بردیم که به سبکی که میرزا غالب انتقاد نموده آن را تنها در زمینهٔ قصیده بطور شایسته می توان اظهار نمود و توسل او بدین صنعت از این جهت است. بعلاوه گوینده ای که در قصاید نتوانست موفقیتی کسب بکند او را شاعری درجه و استادی نخوانند و این وهم تا حدی در ذهن سخنوران مرتکز شده بود که شاعران بزرگ مثل حکیم سنائی و شیخ سعدی و امیر خسرو هم آسایش بخش معصیت نبودند. خود میرزا غالب عقیده داشت کسیکه نتوانست قصیده ای بسراید، نباید عنوان شاعر بار داده، بهمین دلیل ذوق را شاعری کامل و شاه نصیر را شاعری نصف می گفت. صرف نظر از چند قصیدهٔ او که به تشویق دوستان خود به توقع استفاده مادی در مدح فرو حمندان هند نوشته بود تمام قصیده های او مشتمل بر مطالب توحید و نعت و منقبت است. پاره ای از قصیده هایش را در مدح معاصران دانش مند هم سروده است که آنها را مشوق و مربی خود میدانست.

در دیباچه دیوان فارسی پس از ابراز افتخار خود چنین نگاشته است:
"در سپاهی گریبان بالا خوانی نبوده ام و در ادائی که خود را به شگرفی ستوده ام نیمهٔ از آن شاهد بازی ست یعنی بهار پرستی و نیمهٔ دیگر ترنگر ستائی ست یعنی باده خوانی - بیدا دبین، که هرجا بشارت خمی از زلیت مرغوله مویان کشوده شود بلا در من آویزد۔

وقتی میرزا غالب در صحنه شعر فارسی ظاهر شد - در هند دو سبک مورد تقلید سخن سرایان بود و یکی از آنها سبک نظیری و عرفی بود که از زمان اکبر رواج داشت - گوینده دیگری که مورد تقلید شعرا قرار می گرفت میرزا بیدل بود که از عهد عالمگیر مورد توجه گویندگان بود و معاصرین غالب مثل علوی و صهبائی هم از وی تقلید می نمودند و کسانیکه بر زبان فارسی تسلط داشتند از همین دو سبک یکی را بر میگزیدند - اگرچه غزلیات حافظ و خسرو از آنها معروف تر بود ولی بنا بر عللی که مذکور شد او در آغاز سبک بیدل را انتخاب کرد ولی پس از مدتی شعر عرفی و نظیری را مورد تقلید قرار داد و چون مثنوی زبان بیدل را خود اهل زبان قبول نداشتند - او در اواخر عمر خود به قصائد قاآنی توجهی بسیار داشت و روانی و سلاست زبان قاآنی را در کلام خود اختیار نمود و بهمین دلیل در قصائد و قطعات آخر او نسبت به قصاید پیشین این جلوه بیشتر بچشم میخورد۔
ولی باید اعتراف نمود که باز هم غالب در بعض جا ها به سلاست و روانی قاآنی نرسیده۔
فقط قصیده و غزلهای غالب را میتوان با آثار نظیری و عرفی مقایسه کرد چون نظیری در داستان سرائی زیاد قوی دست نبود و از این صنعت شعر صرف نظر نمود - این حقیقت است که عرفی مثنویاتی چند نوشته است ولی صاحب آتشکده درباره یکی از آنها می گوید "بد نگفته است" و برای بقیه مثنویهای او هم می گوید "بسیار بد گفته" پسر حکیم همام طبیب حاذق درباره منتخبات عرفی می گوید ؎

مثنویش طرز فصاحت نداشت کان نمک بود و ملاحت نداشت

البته "ساقی نامه" ظهوری در هندوستان شهرت بسیاری دارد ولی قصاید او چندان اهمیتی ندارد بخلاف میرزا غالب که او هم در مثنوی تسلط کاملی داشت و هم در قصیده و غزل نظیری و عرفی در نثر آثاری نگذاشته اند - البته کتاب نثر ظهوری که نام "سه نثر ظهوری" دارد در هندوستان شهرت بسزائی دارد۔
پس از این بررسی کوتاه و مختصریکه در این صفحات بعمل آمد میتوان استنباط کرد که از شعرای بزرگ مانند امیر خسرو دهلوی و فیضی دکنی، هیچ کسی از گویندگان سبک هندی به پایه غالب نمی رسد و او تنها کسی بود که در آن دوران پر آشوب و فتنه که شمع زبان و ادب فارسی در هند به پایان عمر رسیده بود سعی بلیغ و کوشش مستحسن نمود که آن را دو مرتبه روشن کند و تا حدی موفق گردید ولی متاسفانه اوضاع سیاسی هند در این دوران دیگرگون شده بود و تسلط بیگانگان بر شبه قاره و آرزوی حفظ منافع خود آنها را وا داشت که هرچه غالب و امثال او رشته بودند، پنبه کنند و همین طور هم شد۔

«باسمه سبحانه»

الفكر الجديد

«العدد الثاني»

مجلة عربيّة سنوية يصدرها طلّاب القسم العربي بالكليّة

تحت إشراف:

فضيلة الاستاذ عبد اللّطيف الاعزازي

رئيس لجنة الادب ورئيس القسم العربي في الكلية

رئيس التحرير:

جميل الرحمٰن الدهلوي

المدير المساعد:

محمد رضا احمد الصديقي

كلية دلهي

دلهي

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمة التحریر :

يقولون ان الرسم الثانى خير من الاول والخطوة الثانية تكون اكثر نجاحا. و اننا اذ نقدم إلى القراء هذا العدد فانما هو الخطوة الثانية التى خطوناها فى حياة مجلتنا العربية و لقد حاز العدد الاول كل تقدير وتشجيع من كبارنا و اصدقائنا مما ساعدنا على الاستمرار فى العمل بعزم صميم و ارادة قوية. وليس من المعقول أن نحكم بأن هذا العدد خير من السابق فقد لا يعجب به القارى، ولذا فاننا نترك لكبارنا و أصدقائنا الحكم بذلك. كما ونتنهز هذه الفرصة لنعرب للسادة الاساتذة الكرام و اصدقائنا الاعزاء عن عظيم الشكر على ما قدموه لنا من تعاون علمى و ادبى .

ويسرنا ان تتحلى صفحات المجلة بمقال ادبى تحت عنوان "يقظة الفكر العربى" للاستاذ انور الجندى الذى أرسله إلينا استاذنا السيد سليمان اشرف المحاضر فى الكلية والمقيم حاليا فى القاهرة للدكتوراة كما وتفضل الاستاذ نفسه بكتابة مقال خصيصًا لمجلتنا يجده القارى فى هذا العدد.

ومما يحزننا حزنا شديدًا اننا فقدنا صديقًا من اصدقائنا فجئة باصطدامه بجدار اثناء وثبه للسباحة فى غدير عظيم فى نظام الدين* فانا لله وانا إليه راجعون. وكان المرحوم طالبا فى السنة الثانية لبكالوريوس فى الكلية وكان فتى حديث السن، ذكى الفؤاد، سليم الطبع، لين الكلام ولم تكن الإبتسامة تفارق شفتيه عند الحديث مع اصدقائه و يلتزم الادب والاحترام حينما يتكلم مع كباره وبهذه الصفات المميزة كان عبد المتين المرحوم محبوبا لدى اساتذته واصدقائه جميعا فندعو الله تعالىٰ ان يمطر عليه شأبيب رحمته و يسكنه فسيح جنانه ويلهم ابويه وأفراد عائلته الصبر والسلوان

جميل الرحمٰن الدهلوى
رئيس التحرير
١٩٦٩/٣/١٤م

* اسم مقام فى دلهى.

الاستاذ انور الجندی
(القاهرة)

يقظة الفكر العربي.

[الاستاذ انور الجندی اديب كبير ومفكر عربي معاصر سيال القلم جم التواضع دائم الترحيب للطلبة والابتسامات لاتفارق شفتيه وله نظر دقيق فی الادب العربي المعاصر ومن منا لا يعرف كتبه " أخرجوا من بلدنا " والشعر العربي المعاصر والنثر العربي المعاصر ومعالم الفكر العربي المعاصر وغيرها وهو الآن مشغول بتأليف كتاب واسع فی الفكر العربي المعاصر طلبت منه أن يحرر شيئا لمجلة كلية ، لهی فتفضل بهذا المقال القيم -
سليمان اشرف - القاهرة]

من المؤكد أن " الفكر العربي " يمر اليوم بمرحلة جديدة هذه المرحلة تختلف عن المرحلتين السابقتين : مرحلة الثلاثمائة عام من ١٥١٧ إلى ١٩١٧ وهی فترة قيام الحكم العثمانی حتی إتمام الاحتلال الغربي للعالم العربي ، والفترة الثانية : منذ بدء الاحتلال إلى اواخر الحرب العالمية الثانية ١٩٤٧ . أما الفترة التی نعيشها فهی فترة " النهضة الفكرية والثقافية والاجتماعية " للأمة العربية والعالم الإسلامی كله ، ونحن الآن فی مرحلة النضال بين هذه اليقظة وبين العوامل المعاكسة التی تريد ان تفرض علينا قوى من غيرنا . هذه الفترة التی نعيشها هی فترة البناء الإيجابي للثقافة العربية التی تستمد جذورها اصلاً من الفكر الاسلامی مهما كانت لها طوابعها القومية ، وقد اعطت الثورات وحركات اليقظة خلال هذه الفترة دلالة جديدة على اصالة مفهوم الايمان بالجذور والارتباط الاصيل بمقومات فكرنا الاسلامی بحسبان انه قاعدة الأساس لبناء الحضارة وبناء الفكر فی آن .

وغير خاف ان فترة الثلاثمائة عام كانت فترة ضعف ولكنها لم تكن فترة موت ، فان التحديات التی واجهت الامة العربية والعالم الاسلامی قد دفعته إلى نوع من التقوقع - هو فی ذاته عامل قوة فی هذا الوقت وليس عامل ضغط - انه عامل الحفاظ على التراث من ان يضيع فی خلال العاصفة

وعندی ان مصدر الضعف يرجع إلى ان العالم الاسلامی والامة العربية جزء منه كان قد جرى شوطا طويلا منذ بزوغ رسالة الاسلام فی

خلال الف عام كاملة، ظل له موضع القيادة للفكر الانسانى والحضارة البشرية شارك خلالها مشاركة فعالة فى إنماء الجذور التى قامت عليها الحضارة الحديثة المسماة بالحضارة الغربية، نسبة إلى مكان نموها وتوسعها اساسا.

فما ان دارت "دورة التاريخ" فى خلال الف عام، حتى كانت الرحلة الطويلة قد ارهقت الراحلين وتلك نواميس الكون وسننه فى الحضارات والأمور، فلا بد ان تتسرب عوامل الضعف وتنفصل القيم عن واقع الحياة، فيسود الوهن وتطفى عوامل الشرف والجمود والعزلة.

ومن ثم تنتقل دورة التاريخ إلى قطاع آخر من البشر ليستأنف دورة جديدة كذلك كانت الحضارة الاسلامية العربية دورة مستأنفةً بعد سقوط الحضارة اليونانية والرومانية وكذلك كانت الحضارة الغربية، دورة مستأنفة بعد ضعف الحضارة العربية الاسلامية

غير ان الامة العربية كان لها دائماً "فكراً" له طابعه ومضمونه القوى الحى النفاذ، هذا الفكر لم يسقط عند ما تلاشت الحضارة الاسلامية العربية، وعند ما انطوت الدولة الكبرى المتمثلة فى الامبراطورية العثمانية، ولكنه ظل "موجوداً" وإن خبا ضوءه وعلا أطرافه الصدأ، وبالرغم من انه لم يعد يتفاعل مع الحياة، فقد ظل مستمر الحياة، إلى أن انبعثت منه الصيحة مرة أخرى بالدعوة إلى اليقظة، وبالعودة إلى منابع التوجيه هنا وهناك، فى قلب الجزيرة العربية وفى مساجد القاهرة قبل قدوم أول غزوة حديثة للعالم العربى، وهى "الحملة الفرنسية بقرن من الزمان او يقل قليلا

ومن ثم بدأت "يقظة الفكر العربى" ترسم طريقاً جديداً فكانت هذه المرحلة الجديدة التى برزت مطالعها متمثلة فى عشرات من الاعلام من المصلحين ودعاة التجديد فى مجال الدين والاجتماع والفكر والادب، وقد امتدت هذه المرحلة ما يقرب من قرن ونصف قرن، حتى انتصف هذا القرن، فقد قاوم هؤلاء المصلحون قوى ضخمة من النفوذ الاجنبي والتبشير والتغريب والغزو السياسى والاجتماعى والفكرى فى ظل مرحلة كان الفكر العربي المعاصر يحاول خلالها ان يستعيد مكانته او يصحح مفاهيمه او ينفض عنه غبار القرون التى جمدته واصابته بالضعف ومن هنا بدأت تتكشف صورة هذا الفكر العربي على حقيقته، ويبدو جوهره النقى من خلال ما القى عليه من اغشية وزيوف، ليؤكد حياته وقدرته على الاستمرار والتفاعل مع النهضات

والحضارات وليقرر انه كان دائما قادراً على الإيجابية والفاعلية، وكان ولا يزال يحمل لواء التقدمية والعصرية، متطاولاً مع الازمان المختلفة والبيئات المتعددة غيران النفوذ الاجنبي كان يبغض هذه اليقظة، ولذلك نقد اثار حول هذا الفكر كثيراً من الشبهات، كما انكر ان الامة العربية كيان قائم، وان الشخصية العربية لها طابعها ومعالمها.

ومن هنا كان من الضروري مواجهة هذه الشبهات وكشف دور الفكر العربي في يقظته خلال هذه الفترة من تاريخه وتاريخ الامة العربية قادراً على مساندة ركب النهضة والانطلاق إلى اقامة الحرية والعدل الاجتماعي والوحدة.

وقد استطاعت قوى اليقظة والتحرر ان تقضي على الازمة النفسية التي كانت تمر بالعالم العربي، حين كان يرى نفسه قادراً على منازلة الغرب في مجال الحضارة والعلم التيكنيكي والجيوش والمصانع وتزاحم في مجال العلوم ومن هنا تتفتح لنا في ظل النهضة الحضارية الطريق إلى بناء الفكر العربي من جديد على نحو يكشف عن جدارة الامة العربية في تقديم قوة جديدة للانسانية وضياءاً جديداً لمشعل البشرية الذي يتعرض هذه الايام لكثير من الازمات والاضطرابات المتوغلة في مجال المادية الصرفة، والدعوة العنصرية ومقاومة الحرية الانسانية وقد كانت اولى القضايا التي عالجها الفكر العربي الاسلامي منذ اربعة عشر قرناً حين قال: "لافضل لعربي على اعجمي ولا ابيض على اسود"

ولا شك ان النهضة العربية حين يلتقي اليوم بالفكر العربي وتتخذه اساساً لها وتجعله قاعدتها تستمد منه وتبني عليه انما تأخذ طريقها الصحيح. ولا شك ان اليقظة التي يمر بها فكرنا العربي اليوم قد جاءت بالدعوة إلى صقل المنابع وكشف الزيف عنها واطلاقها من عقال التقليد، واعطائها حقها من التجدد والتطور، بالاجتهاد والاقتباس وبعث القديم النافع، فلقد كان فكرنا العربي الاسلامي دائما فكراً مفتوحاً قادراً على الاخذ والعطاء، له طابعه وملامحه ومقوماته الاساسية الإيجابية التقدمية القادرة على تقبل تيارات الحضارة واعطائها والأخذ منها، وامتصاص خير ما فيها، وهو فكر منطلق لم يتوقف خلال حياته الطويلة إلا بقدر ما تضطره الاحداث حتى اذا خلع منها نفسه عاد سيرتها الاولى، قادراً متحركا، ولئن كان في المرحلة الماضية يبحث عن نفسه، فهو يقيني انه وجد نفسه في يقظتنا الحاضرة وعرف مكانه في الفكر

الانسانى متمثلا فى مقوماته الاساسية ، قلب وعقل، ودين ودنيا، ومادة وروح واجتهاد فى مواضع النظر الجديد، وقدرة على الحركة وايمان بالحياة وتجديد لاسلحته، وحفاظ على ثغوره.

الاستاذ محمد سليمان الشرف

الشعر العربى الحديث ومدارسه

الشعر العربى قبل محمود سامى البارودى (المتوفى سنة ١٩٠٤)

لم يكن الاجسدا بلا روح ومصقلا بالصنائع اللفظية والمعنوية وما كان عند الشعراء من ثلثمائة سنة أى فى عهد العثمانيين إلى نهاية القرن التاسع عشر شغل شاغل غير ان ينظموا قصائد مدح للأمراء والوزراء أو يجربوا قرائحهم فى نظم التواريخ فى مناسبات شتى وعبد الله باشا فكرى ومحمود صفوت الساعاتى والشيخ على الليثى خير مثال لهذا الشعر الركيك والشعر كان بين هذه التواريخ والالاعيب اللفظية حتى برز البارودى فأعاد الشعر إلى مجده القديم وأطلقه من جميع القيود وأعطاه حياة جديدة ولذلك يعد البارودى ارهاصا للشعر الجديد. والجدة فى شعره من ناحية الاغراض فيمدح ويصف ويرثى ويعتب ويفتخر مثل الشعراء العباسيين ولكن الجدة فى شعره فى الوصف بأنه افرد قصائد كاملة ووصف الطبيعة ومناظر الريف ووصف مخترعات جديدة واشياء أخرى كثيرة كالسجن والقطار والمجهر وغيرها.

وجميع الشعراء الذين جاؤا بعده مثل احمد شوقى (م ١٩٣٢) وحافظ ابراهيم (م ١٩٣٢) واسماعيل صبرى (م ١٩٢٤) ومعروف الرصافى (م ١٩٢٥) وغيرهم. ولا يتقدم منه إلا قليل قليل حتى احمد شوقى مع كل موسيقى وجمال شعره الذى يميزه من البارودى ليس إلا من تقليد البارودى أو الشعراء العباسيين ويحسن فى التقليد. فماذا يا ترى الجديد فى آثار قريحته ؟ اللون الجديد فى شعره هو فى الشعر الذى حاول فيه ان يحاكى الشعراء الفرنسيين مثل فيكتور هوجو (VICTOR HUGO ١٨٠٢ — ١٨٨٥) ولافونتين (LA FONTAINE ١٦٢١ — ١٦٩٥) وقصيدته المشهورة " كبار الحوادث فى وادى النيل " التى سرد فيها تاريخ مصر من عهد الفراعنة إلى عهد أسرة محمد على متأثرة الى حد كبير بالديوان الشعر لفيكتور هوجو

المسمى بأسطورة القرون وهو جوتى قصيدته الخالدة يذكر الحياة الانسانية منذ ظهور حواء.

والنزعات الجديدة ظهرت فى الشعر العربي عندما ظهر الجزء الاول منذ خليل مطران (م ١٩٤٩) عام ١٩٠٨) ثم ظهر الجزء الاول من ديوان عبد الرحمن شكرى فى سنة ١٩٠٩ (م ١٩٥٨) وكلاهما كانا مثقفين بثقافة أوروبية. خليل مطران برع فى اللغة الفرنسية وقرأ الشعراء الرومانسيين الفرنسيين - هوجو لامرتين والفريد دى موسيه وغيرهم. وترجم كثيرًا من روايات لشكسبير من اللغة الفرنسية لانه كان قليل الحظ باللغة الانجليزية ومن اجل ذلك نجد فى شعره أثر الشعراء الفرنسيين الرومانسيين واضحا.

وأما شكرى نغرق إلى اذنيه فى اللغة الانجليزية وقرأ معظم دواوين الشعراء الرومانسيين الانجليز وردسورث كولردج وشيللى وبيرون وكيتس وغيرهم وتأثربهم. ونشر سبعة دواوين من سنة ١٩٠٩ إلى سنة ١٩١٩ وكذلك تميلاه إبراهيم عبد القادر المازنى (م ١٩٤٩) وعباس محمود العقاد. (م ١٩٦٤) كانا مولعين بالأدب الانجليزى واستفادا منه بأكبر قدر ممكن. والمازنى قد أصدر ديوانه الأول والثانى منذ ١٩١٤-١٩١٧ والعقاد قد أصدر ديوانه الاول "يقظة الصباح" عام ١٩١٦. ولكن المازنى اعراض عن قرض الشعر بسبب النقد اللاذع من الاعداء ومال إلى النثر وأما شكرى فقد سكت كل سكوت على الرغم من انه كان ذا طبيعة فياضة وقريحة وقادة ولعل سبب ميله عن الشعر يرجع إلى سوء معاملة النقاد وعدام ترحيبا بتكاراته الفنية وإما ثالث ثلاثة العقاد فاستمر قرض الشعر حتى وافاه اليقين وكمل تسعة دواوين ونشر ديوانه العاشر" ما بعد البعد" بعد وفاته

وأصدر المازنى والعقاد كتابا أسماه " الديوان" عام ١٩٢١ وجعلا فيه الشوقى والمنفلوطى هدفا لنقدهما اللاذع ولم يظهر من الديوان إلا جزءين والكتاب "الديوان" أسس مبادئ جديدة وهذه المدرسة مدرسة العقاد والمازنى وشكرى تعرف بمدرسة الديوان وشكرى بعد من هذه المدرسة مع انه لم يؤد دورًا عمليا فى تحرير الديوان ولكن مقدماته التى قدم بها دواوينه تميل إلى نفس الاتجاه.

ثم يظهر كتاب " الغربال لميخائيل نعيمه عام ١٩٧٤ ويحتوى مقالات نقدية للمؤلف وميخائيل نعيمه يعتقد فى ادخال المعنى الجديدة والاساليب الحية فى الشعر والأدب والغربال لشعراء المهجر بمثابة كتاب " الديوان لشعراء مصر أدباء المهجر هم العرب الذين هاجروا من البلاد العربية إلى هذه المدرسة زملاء المهجر جبران خليل وايليا ابو ماضى و ميخائيل نعيمه وفوزى المعلوف .

ويمكن ان نتخلص دعوات هذه المدارس إلى التجديد فى نقاط آتية

(١) ان تكون القصيدة فى موضوع واحد ولا ينتقل الشاعر من مضمون إلى مضمون كما كان الشعراء القدامى يفعلون والقصائد فتاة الجبل الأسود لمطران وثورة النفس لشكرى وترجمة شيطان للعقاد خير نماذج لوحدة الموضوع .

(٢) مضمون الشعر جديداً ومستمداً من الحياة والأشياء البسيطة التى تحيط بنا كما فعل العقاد فى ديوانه " عابر سبيل " الذى تناول فيه الاشياء العادية مثل بيت يتكلم وعسكرى المرور وكواء الثياب وبائع الساعة الثانية وهو يقول فى قصيدة كواء الثياب .

لو تنم لا تنم　　إنهم ساهرون
سهروا فى الظلم　　أو غفوا يحلمون
انت فيهم حكم　　وهم ينظرون
فى غد يلبسون　　فى غد يمرحون　(ديوان عابر سبيل ص ٣٩)

(٣) ويكون الشعر ذاتيا وجدانيا يعنى أن يذكر الشاعر تأثراته وانطباعاته ولعل احسن ما قال شكرى فى هذا المعنى وصدر به ديوانه الاول " ضوء الفجر " ألا يا طائر الفردوس إن الشعر وجدان .

(٤) التحرر من القافية والدعوة إلى الشعر المرسل (BLANK VERSE) اى الشعر الذى لا يلتزم بقافية واحدة مثلاً قصيدة كلمات العواطف التى يقول فيها شكرى :

خليلى والاخاء إلى جفاء　　اذا لم يغذه الشوق الصحيح .
يقولون الصحاب ثمار صدق　　وقد نيلوا المرارة فى الثمار
شكوت إلى الزمان بنى إخائى　　فجاء بك الزمان كما أريد

(ديوان شكرى ص ٩٩)

(٥) العناية بالمعنى وادخال الأفكار الفلسفية والتأمل وزيادة نزعة الانسانية في شعرهم.

(٦) الاهتمام بوصف الطبيعة ولاشك أن موضوع وصف الطبيعة قديم والشعراء تناولوا منها ما تناولوا ولكن هذه الشعراء خلعوا عليها صفات الانسان دعوا طفه وامياله دجعلوا هامرآة تعكس ما في نفوسهم من آمال وأخران تشاركهم الطبيعة في سرائهم وضرائهم وتسري عنهم همومهم.

وقديما قال البحتري في وصف الربيع وقد أجاد فيه:

أتاك الربيع يختال ضاحكا: من الحسن حتى كان أن يتكلما.

ولكن الاندماج والالتحام مع الطبيعة الذي نشعر في شعر ايليا ابي ماضي لايوجد في شعر البحتري ابوماضي يخاطب حبيبته في قصيدته" المساء ويصف تأثير حلول المساء وغروب الشمس في مشاعرها وأفكارها.

السحب تركض في الفضاء ÷ والمراكب ركض الخائفين

والشمس تبدو وخلفها ÷ صفراء عاصبة الجبين.

والبحر ساج صامت ÷ فيه خشوع الزاهدين.

لكنما عيناك باهتتان في الافق البعيد

سلمى بماذا تفكرين ؟

سلمى بماذا تحلمين ؟

(٧) وادخال القصائد الدراماتيكية او القصصية في الشعر التي لم يكن عهد بها في الشعر العربي القديم مثلاً قصة نابليون من جنوده وقصة مقتل بزرجمهر لخليل مطران وقصة كسرى والاسيرة لشكري.

وفي عام ١٩٣٧ الدكتور زكي ابوشاوي (م ١٩٥٥) الذي يعد نفسه من تلامذة خليل مطران كوّن جماعة للشعراء والادباء وأصدر والمجلة أسماها "أبولو" و هذه المجلة كانت قليلة الحظ من الحياة فاستمرت سنتين ١٩٢٧-١٩٢٤ ثم توقفت وساهم فيه كثير من الشعراء والأدباء بنتائج افكارهم واستمرت (مدرسة ابولو) مسيرها في نفس الطريق التي مهدت لها مدرسة الديوان ولكنهم لم يكونوا من تقليدهم فحسب بل زادوا في جميع الاتجاهات فزادت عندهم نزعة الرمزية والواقعية والسريالية داى الواقعية)

والشيئ الذى يلفت الانظار ولايوجد إلا فى الأدب العربى بأن بعض الشعراء خصصوا زوجاتهم بالشعر ونظموا فيها بعد وفاتها ديوانا كاملاً فديوان عزيز اباظة «وفات حانًا» وديوان عبد الرحمن صدقى من وحى المرأة من هذا القبيل وهو يقول:

لقد عادت اجل عادت دربى ÷ صديقى زوجتى وكمال حسبى
لقد عادت وجمع الصحب عندى ÷ فملت لهمسها ونسيت صحبى
وناجتنى وناجتنى طويلا ÷ كصوب المزن عاديل جدبى

وزاد عندهم الميل إلى الشعر الموسل والشعر الحر (FREE VERSE)
(من وحى المرأة ص١٨٧)

والشعر الذى لا يلتزم ببحر واحد) وخصوصًا بعد اليقظة الفكرية فى البلاد العربية قد كثر عدد الشعراء الذين ينظمون الشعر بدون أن يثقلوها بقيود القوافى والبحور ويكتفون بالموسيقى الداخلية فى الشعر وتقول ملك عبد العزيز شاعرة مصرية معاصرة فى قصيدتها " أغنية المطر"

لو عدت يا مطر
لاهتززت الأرض الخصيبة الثمر.
وفجرت كنوزها العيون والشجر
لارتوت الجذور
تفتحت براعم الظهور .
وارتعشت فى كل عرق نبضة الحياة (ديوان قال المساء ص١١)

ومن ابرز شعراء هذه المدرسة (مدرسة ابولو) ابو شادى وناجى وعلى محمود طه حسين اسماعيل، حسن كامل الصيرفى صالح جودت واحمد رامى والهمشرى

وهذا المقال ليس الانظر عابر على المدارس الشعر العربية الحديثة وللحديث فيها اوسع مجال ولو كانت المجلة كبيرة الحجم لأعطيت قلمى حرية كاملة .

خلاصة لبعض المقامات للبديع
محمد شفيع الرحمن البهاری
الطالب فی الصف النهایة للماجستر

المقامة الاولی القریضیة

یحدث عیسی بن هشام راوی المقامات انه سافر مرةً إلی جرجان بقصد التجارة وبعد وصوله هناك اشتری دارًا وضیاعًا وجعل تلك البلدة مأواه. واتخذ هناك من الأصحاب عدةً لیقضی فراغ أوقاته فی المحادثة معهم والمنادمة فجعل وقته حصتین للدار والحانوت فكان یقضی صباحه ومساءه فی الحانوت بین أصدقائه وندمائه وحبس الباقی من اوقاته علی الدار واتفق یومًا أنهم استرسلوا الحدیث عن الشعر او الذین عاشوا فی الازمنة الخالیة فتقدم إلیهم رجل شاب ولما احتدم الجدال وشب الكلام نهض ذلك الفتی وافتخر بأنه من أصحاب البیان وقد قطع شوطًا بعیدًا فی ذلك المضمار فطلب منه حاضروا المجلس أن یعبّر عن آرائه فی الشعراء الماضیین فقال فی امرئ القیس انّه فاق اقرانه فی القریض " ولم یقل الشعر كاسبًا ولم یجد القول راغبًا" وقال فی النابغة إنّه كان شاعرًا مفلقا وأصاب هدفه فی الشعر ولم یخطئ وإنه " یثلب إذا حنق ویمدح اذا رغب" واما الزهیر فانه فقید المثال فی میدان القریض وكان سحر البیان، والطرفة " كنز القوافی، ومقصی نخبه" ولم یطّلع علی خزائنه احدٌ من الناس و لم تغلطها اسرار دفائنه" وقال فی الجریر والفرزدق إن الاوّل منهما یاتی بشعر یحمل رقةً وتأثیرًا بالغًا فی طیّه وغزله أرق واعذب من غزل الفرزدق واما المتقدمون من ذوی القریض فانهم كانوا یعنون بالالفاظ اكثر من العنایة بالمعانی والمتأخرون ذهبوا علی سبیل خلافهم فهم یهتمون بالمعانی اكثر من الاهتمام بالالفاظ ثم أخبر الفتی عن نفسه فقال إنه كان ذا ثروة طائلة ولكن الزمان اغتاله وسلب ماله. یقول عیسی إنه تأمل فیه فعرف انه كان ابا الفتح الاسكندری. فعجبت منه كثیرا

المقامة الثانیة الازاذیة.

یحدث ایضًا عیسی بن هشام إنه كان مقیما فی بغداد زمن حصاد الازاذ وهو نوع من التمر فخرج یومًا إلی سوقها لاجل شراء الفواكه فاشتری هناك من الثمرات ما اشتهت نفسه فلما همّ بالرجوع إلی داره بعد الشراء وقضاء الحاجیات

وتقع نظره على رجل قد بسط يده إلى المارين به وكان قصده سؤال شيء من الطعام الذى يسدّ خلته وكان الرّجل متأبطًا أطفاله ليحضّ النّاس على الكرم والرحم عليه ولم يكن سؤاله باهظا على كاهل أحد فإنه كان يسئل شيئًا من السويق مع فلذات من الشحم وكان يقول:

ويلى على كفّين من سويق أو شحمةٍ تُضرب بالدقيق
او قصعة تملأ من خرديق يفثأ عنا سطوات الريق

يقول عيسى إنّه تقدّم إليه ودفعه شيئًا من النقود فسرّ ذلك الرجل سرورًا لا يقدر وكاد أن يطير بالفرح والسرور وتمنّى لعيسى بجزيل الثواب عند ربّ العالمين فطلب منه عيسى أن يظهر سرّه ويكشف له عن نفسه من اين هو ومن هو؟ فرفع الرجل لثامه عن وجهه المغطى فعرف عيسى أنّه الشيخ المعروف ابو الفتح الاسكندرى فلم يملك عيسى نفسه من أن يتعجب.

المقامة الثالثة البلخية

يقول عيسى بن هشام إنّه خرج مرة إلى بلخ وكان يستهدف فى سفره التجارة فى الأثواب القطنية وإنه كان انذاك مجدول القوى ومفتول العضلات أى شابا قويا لا يهمّه شئ إلا الإنشاد والتقريض وكان يظن أنّه من أصحاب البيان بل من أمرائه ويقول إنّه لمّا همّ بالخروج من بلخ إلى بلدة أخرى تقدّم إليه شابٌ كان فى زىّ حَسَن وفى لحيته طولٌ وكثافة ولقى ذلك الشابُّ عيسى بطلاقة الوجه بحيث دفع ذلك عيسى إلى الإعراب عن كلمات الثناء له ثم سأل الرجل عيسى عن إرادته فأبان همّه وقال إنّه يريد السفر إلى بلد آخر فتمنى الرجل لعيسى بالسفر الآمن وطلب منه أن يحمل له شيئًا من الدنانير حين يرجع من سفره فأخرج عيسى من فوره مقدارا من النقود ودفعه إليه واعدًا له بمثل ذلك فى القابل فانشأ الرجل ينشد اشعارا فى مدحه وذكر سماحته وبرّه له ويقول.

رأيتك حمّا خطبتُ العُلى لا زلتَ للمكرماتِ أهلاً
صلبتَ عودًا ودُمتَ جودًا وفُقتَ فرعًا وطبتَ أصلاً

وعند ما سأله عيسى عن اصله أجاب أنّه ينتمى إلى قريش ولكن بعد طول التأمل ظهرت خفاياه وعرف انه الشيخ ابو الفتح الاسكندرى.

المقامة الرابعة السجستانية

يحدث عيسى ايضًا أنه سافر مرةً إلى سجستان فى حاجة واقترب من البلد حين مالت الشمس إلى الغروب فقضى تلك الليلة فى مكان أسدل فيه الليل ستاره ولما أقبل الصباح بنوره وسناه مشى إلى السوق فوصل إلى وسطها حيث وقع نظره على رجل قد ركب فرسًا وهو يقول بصوت جهورى "أنا باكورة اليمن وأحد وثة الزمن وداعية الرجال وأحجية ربات الحجال" وإنه خاض المعارك وسلب الدفائن ونهب الخزائن وهو أخو الوغى وصاحب الغرام ومع ذلك كله لم يركب يومًا مطية الشهوات وأعرض عن المخزيات والآن عند ما تأهب للآخرة احتاج إلى مزيد زاد لتلك السداد فهو يريد تقديم شيئ ينفع عامة الناس ولا يريد أن يضن به أبدًا ويحتسب بذلك ثواب الآخرة ثم أخرج قنينةً فيها دواء وحظ الناس الموجودين هناك على دوائه فلما تأمل الراوى فيه قليلا تبين له أنه الشيخ المعروف ابو الفتح.

المقامة الخامسة الكوفية

يحدث عيسى بن هشام ايضًا أنه قضى أيام شبابه فى إتباع شهواته والركوع امام طلبات نفس الإمارة بالسوء فلما ولى الشباب النضير هاربًا وتسرب إليه الشيب رويدًا رويدًا وابيض قذاله أراد أن يعاود ما قد ضيع فى عصر الشباب من ثروات الآخرة فانكر كثيرا فى إحراز زاد التقوى لسفره إلى الدار الآخرة. فصمم على الخروج إلى مكة لأداء فريضة الحج ممتطيا على ظهر مدرب وفى الطريق لقيه راحل آخر وعند الاستعلام من طرف عيسى علم بأنه كوفى من جهة السكنى وصوفى من جهة المذهب فوجد عيسى فيه صديقا حميما وانتهى ذلك الرجل به إلى بيته ليقضى ليلتهما فيه بالفراغ وعند ما أسدل الليل ستاره وعم الظلام طرق الباب أحدٌ وقد عه حينًا لآخر وعلى الاستعلام أجاب الطارق أنه غريبٌ قد طرق إليه من فج عميق وأنه صفر اليد يحتاج إلى شئ يسد خلته فهو جائع وطريد فرق قلب عيسى له وفتح الباب فعرف أنه شيخه ابو الفتح فتبسم وجعل ينشد أشعارا يذكر فيها ثروته الطائلة وغول الزمان.

جميل الرحمن الدهلوی
الطالب فی السنة الاولیٰ للماجستر

"الفرزدق"

ولد ابوفراس همام بن غالب الدارمی ثم التمیمی فی بصرة وقضی ایام حیاته الابتدائیة فیها ونشا فی مهد العلم والادب ودرس علی ابیه الشعر حتی نشأت فیه الملکة الشعریة فبدأ یقرض الشعر فی ایام طفولته وبعد وقعة جمل ذهب به ابوه إلی علی کرم الله وجهه یفتخر بقرض الشعر فی صغره فنصحه علی کرم الله وجهه بحفظ القرآن وتأثر الفرزدق بهذه النصیحة وعهد أنه یحفظ القرآن ووضع السلاسل فی رجلیه وحلف أنه لایحلها الابعد أن یحفظ القرآن فوفی یمینه وحفظ القرآن وذهب إلی ولاة الکوفة یمدح خلفاء بنی امیة وعلی الاخص عبدالملك وحصل علی کثیر من الجوائز والهدایا من الولاة ولکن ما استطاع ان یحرز رتبة عندهم لانه کان یمدح آل علی کرم الله وجهه

وترقی شعره بسبب خصومته مع جریر الذی کان شاعرًا فی عصره وبدأت مقابلته فی الهجو لاجل رجل یدعی بعیثا الذی کان خصما لجریر یهاجره فاتفق الفرزدق مع بعیث فی هجوه لجریر فرد علی اشعاره بالمثل ومن هنا نشأ أساس الخصومة بینهما واستمرت هذه المشاوات والمناقشات الشعریة طوال اربعین سنة . یذم کل واحد منهما خصمه وکان جریرا الشخص الوحید الذی تحدی الفرزدق وواجهه مواجهة قویة

وکان الفرزدق سیئ السیر والسلوك، شنیع الاعمال، فاحش الکلام یتهم النساء العفیفات ولذلك یختار اسلوبا غیر لین فی رد خصمه ویقول الکلام الصارم لیهزم حریفه وأما جریر فمع أنه لا یستعمل الالفاظ الخشنة والمعانی المستهجنة فی الأشعار ولکنه فی رده ینهج منهجا یفحم الفرزدق ویجعله یعجز عن الکلام فی بعض الاحیان وادت هذه المناقشات الشعریة إلی التنور فی عقلیهما والقوة فی خیالهما کما کان ذلك سببًا فی سرعة انتقال الذهن والبداهة فی القول حتی برع الشاعران المعاصران واصبحا ماهرین فی فن الشعر والقریض.

وکان الفرزدق ینتمی إلی قبیلة قریش وکانت قبیلته تشتمل علی افراد کثیرة وکانت ذات ثروة ومال، مشهورة فی الشجاعة والبسالة، ممتازةً بالنبل والکرامة ولذلك یفتخر الفرزدق بهذه المیزات الخاصة التی اشتهرت بها أسرته ویذکر مفاخرها وامجادها وبطولاتها وفعالها الحمیدة فی أشعاره وکان کثیر الفخر والاشادة بنفسه ولم یکن یتلکأ فی أن ینشد هذه الاشعار الملیئة بمدائح أسرته امام الخلفاء وان لم یعجبوا بها.

وکان الفرزدق رجلاً شجاعًا لایخاف من قول الحق وتدل اشعاره المشهورة المرتجلة فی مدائح

علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہ علی شجاعته ولما سأل هشام بن عبد الملك فی احسن المناسبات اثناء الحج عنه بقوله: من هو. وهو يريد بذلك التجاهل والتهكم به. اجابه الفرزدق باشعاره الآتيه.

(١) هذا الذی تعرف البطحاء وطأته ※ والبيت يعرفه والحل والحرم
(٢) هذا ابن خير عباد الله كلهم ※ هذا التقی النقی الطاهر العلم
(٣) يُغضِی حياءً ويُغضَی من مهابته ※ فلا يُكلَّمُ إلا حين يبتسم
(٤) يَنْشَقُّ نورالهدیٰ عن نورِ غُرَّته ※ كالشمس تنجاب عن إشراقها الظُّلَمُ
(٥) وليس قولك من هذا بضائره ※ العرب تعرف من انكرت والعَجَمُ
(٦) اذا رأته قريش قال قائلها ※ إلی مكارم هذا ينتهی الكرمُ

مزايا شعر الفرزدق

كان الفرزدق وجرير شاعرين متفوقين فی الهجاء كل منهما كان يهجو بنوع خاص. ويختلف الناس فی تقديم احدهما علی الآخر غير ان هناك اشياء كثيرة قد اتفقوا عليها.

إن الفرزدق انفرد بالفخر، وشعره صلب خشن الالفاظ يثقل المعانی فی معظم الاحيان فكثيرا ما نراه يتغزل فيثقل لفظه علی الاسماع وتجفو معانيه عن النفس.

وأن طبيعة نشأته الاولیٰ كان لها تأثير ملحوظ فی كل استعارة حيث أنه كان قد ورث عن أسرته وقبيلته عزة النفس وشدة البأس وقوةَ العزيمة والنفورَ من الخضوع للنظام والاستسلام للسلطات

فلذلك نراه عند ما يريد ان يهجو احدا يميل بهجائه إلی الفخر والمباهاة وكثيرا ما يلجأ إلی التعرض لما فی خصمه من عيوب ونقائص فيكبر نفسه، يقلل شأن خصمه وكان إلی ذلك حديد اللسان طويله معجبا بالاسراف فی الهجاء

مقارنة عابرة بين الفرزدق وجرير

قد اتفق الباحثون علی أن الفرزدق خشن فيكون شعره غالبًا مشحونا بالالفاظ الخشنة والمعانی الغليظة وعلی العكس من ذلك فإن شعر جرير يتسم بالرقة واللين والعذوبة. فعند ما يتغزل الفرزدق يثقل لفظه علی السمع وتنبو معانيه عن القلب. اما جرير فشعره يتصف بالمعانی الحلوة السائغة والنغمة المحببة إلی النفس.

كان الفرزدق حديد اللسان جافی الغزل وكان جرير عفيفا عذب القريض فالفرزدق عند ما يهجو يميل إلی الفخر والتبجح وعند ما يهجو جرير فانما يميل بهجائه إلی اللذع. (للمقال بقية)

الملحوظة: لم نستطع ان ننشر هذا المقال بكامله وذلك لان عدد الصفحات العربية محدود: جميل الرحمن الدهلوی.

نشاطات لجنة الادب

كما جرت العادة لافتتاح جميع اللجان فى الكلية فقد افتتحت لجنة الادب ايضًا فى شهر اكتوبر سنة ١٩٦٨م تحت رئاسة السيّد محمد منور النينار استاذ اللغة العربية فى جامعة دلهى ومن حسن حظنا ان صديقنا السيد عبد الخالق المتخرج من هذه الكلية والمشتغل الآن كمترجم فِي السفارة الهندية بالكويت قد حضر فى هذه الحفلة الافتتاحية وقدّم بعض الكتب العربية الى اللجنة فنشكره الاستاذ السيد عبد اللطيف الاعزازى رئيس اللجنة ورئيس القسم العربي فى الكلية وقد سُلّمت الكتب إلى المكتبة.

وقد القيت مقالات رائقة علىٰ مواضيع مختلفة حسب تفصيل الآتي.

(١) احمد شوقى بك :- لريحان الحق السنة النهائية للماجستر
(٢) الفرزدق :- لجميل الرحمٰن الدهلوى السنة الاولى للماجستر
(٣) محمود سامى البارودى باشا :- لانيس الرحمٰن الدهلوى السنة النهائية لبكالوريوس
(٤) الحركة الشعوبية : لعماد الحسن آزاد الفاروقى السنة النهائية للماجستر

وقد اقيم برنامج للنزهة وخرج طلاب العربية والاردية معا فى رفقة الاساتذة إلى زيارة بعض الآثار القديمة خارج دلهى وتمتعوا بذلك كثيرا

وعقدت مسابقة الانشاء العربي اشترك فيها اكثر طلاب العربية وفيما يلى اسماء الطالبين الفائزين فيها.

(١) جميل الرحمٰن الدهلوى الطالب فى السنة الاولى للماجستر — فاز بالدرجة الاولى
(٢) محمد اسرار البجنورى الطالب فى السنة الاولى لبكالوريوس — فاز بالدرجة الثانية

وستمنح لهما الجوائز فى شكل الكتب فى حفلة توزيع الجوائز السنوية للكلية وستقدم الشهادات المطبوعة من اللجنة للطلبة الذين فازوا فى مختلف ارجه النشاط المتعلقة باللجنة وما كانت هذه عادة سارية قبل هذه السنة

اكملت اللجنة السنة الثانية من عمرها مع الحسن والكمال تحت اشراف فضيلة الشيخ السيد عبد اللطيف الاعزازى رئيس القسم العربي ورئيس اللجنة فى الكلية متع الله له بالصحة والعافية ونرجو من الله تعالى ان تتقدم اللجنة إلى الامام فى نشاطها.

محمد شفيع الرحمٰن البهارى السكرتير للجنة.